MIRZA YAR JUNG

ہندوستان عہد اورنگ زیب میں

اس کتاب کا صرف باب دہم لکھنا میرا اصلی مقصد تھا لیکن جن رائے کا اظہار باب مذکور میں کیا گیا ہے اسکی تائید کے لئے مواد کی ضرورت تھی - لہذا باب دوم لغایت باب نہم لکھے گئے جن میں زیادہ تر ہندوستان کی وہ تمدنی حالات دکھائی گئی ہے جو عہد اورنگ زیب میں تھی اور اسکے ثبوت میں ایک ایسے انگریز سیاح و تاجر کے سفرنامے سے اقتباسات کئے گئے ہیں جسنے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور جسکا تفصیلی حوالہ تمہید میں دیا گیا ہے - میں جناب کی خدمت میں یہ کتاب اس غرض سے روانہ کرتا ہوں کہ جن مسائل پر تاریخی واقعات کی مدد سے میں نے باب دہم کے تینوں حصوں میں بحث کی ہے انکے متعلق جناب کی آزادانہ رائے معلوم کرنے کا مجھے شرف حاصل ہو تاکہ اپنے ہندو و مسلمان برادران وطن کے ہر طبقہ کے اصحاب کے اصلی خیالات و جذبات سے مجھ کو آگاہی ہو جائے اور انکی مدد سے میں اپنی رائے میں اصلاح کر سکوں میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ جناب کی رائے جناب کے نام گرامی کیساتھ پبلک میں یا آئندہ کسی مضمون میں بغیر آپ کی اجازت کے نہ پیش کرونگا - جواب دینے کی نسبت میرا مطالبہ درخواست کسی قدر سخت ہے اور اس سے آپ کی تضیع اوقات ہونے کا اندیشہ ہے لیکن میں اس کتاب کے متعلق کوئی مفصل و مکمل تقریظ نہیں چاہتا بلکہ صرف تبادلہ و درستی خیالات مقصود ہے اسلئے اگر ان مسائل پر کم از کم چند سطور میں بھی آپ اپنی ذاتی آزادانہ رائے تحریر فرما دیں گے تو میرا مقصد حاصل ہو جائیگا اور اس کے لئے کل کتاب کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے - صرف باب دہم کے تینوں حصوں کا مطالعہ کافی ہوگا - میں بحیثیت ایک کمترین خادم قوم یہ درخواست کرتا ہوں اور تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں - فقط

باب اوّل

تمہید

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نامِ نیکت برقرار

"زمانہ" کے مارچ و اپریل ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا عنوان یہ تھا "ہندوستان عہدِ مغلیہ میں" مضمون مذکور میں چند واقعات بیان کرکے اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں رشوت کا بازار بے حد گرم تھا۔ رعایا مفلوک الحال تھی اور بہت افلاس و تنگدستی میں بسر کرتی تھی۔ عوام کی اقتصادی و تمدنی حالت سنوارنے کی کوشش نہیں کیجاتی تھی وزرائے سلطنت نیک نفس، مردم شناس و منتظم نہ تھے۔ تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد تھیں کہ جن سے اوس کی ترقی دشوار تھی۔ صداقت نابود تھی، فرامینِ شاہی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ سمندر میں بحری قزاقوں کے بیڑے پھرا کرتے تھے۔ اندرون ملک راہزنوں کا بڑا زور تھا۔ مغلوں کا لشکر ایک بے قاعدہ فوج کا مجمع تھا۔ بڑا حصہ زمین کا ویران اور غیر آباد تھا۔ کالج اور تعلیم گاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔

مسٹر رائے صاحب نے اپنے مضمون کی تائید میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے اُن خطوط کا حوالہ دیا ہے جو کہ مختلف اوقات اور سنین میں انہوں نے ولایت کو اپنے آقا ڈائرکٹرس کو اطلاع

دینے کی غرض سے لکھے تھے اور ایک فرانسیسی سیاح کی تحریر سے بھی استدلال کیا ہے
مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب کے اس مضمون نے پہلے مجھ کو صرف یہ خیال دلایا تھا کہ
"ہند بعہد اورنگ زیب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جائے۔ لیکن ہندو
مسلمانوں کے آجکل کے نزاعوں سے اس اندیشہ نے کہ کہیں ایسے مضامین سے
جن میں صحیح واقعات کا اظہار نہ ہو غلط فہمی بڑھ کر ملک کے حالات بد سے بدتر نہ
ہو جائیں۔ میرے خیال کو مصمم ارادہ کر دیا۔ صحیح ہے کہ یہ مضمون تاریخ کی
وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہد اورنگ زیب کے تمام
واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اسمیں زیادہ تر عہد اورنگ زیب
کے وہ چند واقعات پیش کئے گئے ہیں جنکو عہد مغلیہ اورنگ زیب کے متعلق اصحاب
رائے عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان واقعات کا انتخاب کپتان الگزنڈر ہملٹن کے
سفرنامے سے کیا گیا ہے۔ الگزنڈر ہملٹن ایک انگریز سیاح و سوداگر تھا۔ یہ شخص علمی
حیثیت سے بھی معمولی شخص نہ تھا۔ یونیورسٹی میں تعلیم پا چکا تھا تقریباً ۱۶۸۸ء میں
جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا یہ شخص بہت سا سوداگری مال و اسباب لیکر معہ چند
توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ولایت سے روانہ ہوا ہے اور تمام ساحل
افریقہ و عرب و ایران پر تجارت کرتا ہوا بالآخر ہندوستان کے ساحل پر پہنچا ہے
تخمیناً ۲۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں اپنی زندگی بسر کی ہے
اس شخص نے اپنا ایک سفرنامہ لکھا ہے جسکی دوسری طبع ۱۷۳۹ء کی ہے۔ یہ سفرنامہ
دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسوقت "کتب خانہ آصفیہ" حیدرآباد دکن میں موجود ہے
یہ کتاب پرانی انگریزی میں لکھی گئی ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ یہ سوداگر

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ لہٰذا اکثر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس اور اُن کے ملازمین کی پولیٹیکل حرکات و رچالوں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے غالباً اُسوقت کپتان صاحب کو اسکا خیال بھی نہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وہ چالبازیاں جن کو انھوں نے اپنے سفر نامے میں نظرِ حقارت سے دیکھا ہے بالآخر اُن کی قوم کی حکومت اس ملک میں قائم کردیں گی۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے جس کو ہمارے بعض مورخ ہونے کے مدعی سب سے زیادہ متعصب مسلمان مغل بادشاہ ظاہر کرتے ہیں۔ ساحل ہندوستان پر کوئی ایسا بڑا شہر نہ تھا کہ جہاں یہ مصنف گیا ہو علاوہ بریں سورت، احمد آباد، دہلی، آگرہ، کلکتہ وغیرہ کی بھی اس نے سیر کی ہے ایک موقع پر اورنگ زیب کے روبرو بھی پیش کئے جانے کی عزت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص کا علم ذاتی ہے اور اس کے بیانات بادی النظر میں بے غرض اور بے لوث معلوم ہوتے ہیں میں نے اپنے مضمون میں کپتانِ موصوف کی اسی عینی شہادت پر استدلال کیا ہے اور جو شہادت میں پیش کرتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو اُن واقعات کی بہت کچھ تکذیب ہوتی ہے جن پر مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے اپنی رائے قائم کرنے میں استدلال کیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتے یا ڈائرکٹرس غلط واقعات کیوں لکھتے اس کے متعلق ناظرین اولاً اس مضمون کے باب (۹) کو ملاحظہ کریں اس کے بعد وجوہ خود ذہن میں آجائینگے فرانسیسی سیاح کی بابتہ جس کی کتاب کا حوالہ مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھہ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ امر قابلِ غور ہوگا کہ اُس سیاح کے ذرائع علم کیا تھے۔ اُس نے کس زمانہ میں اور کتنے روز تک اس مُلک کو دیکھا۔ بالآخر ناظرین سے

یہ میں التجا کروں گا۔ کہ اگر اس مضمون کی کوئی عبارت خلافِ مزاج ہو تو معاف فرمائیں
کسی کا دل دکھانا میرا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اِس مضمون کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اگر
گذشتہ صحیح تاریخی واقعات سے لاعلمی یا غلط فہمی نے ہندو مسلمانوں کے دلوں پر ایک
دوسرے کے مقابل کوئی غبار پیدا کر دیا ہے تو اسکے دُہونے کی کوشش کروں اور
اگر اس مضمون سے انکی باہمی محبت وارتباط کی زنجیر کو کچھ بھی تقویت حاصل ہو سکے
تو میرا اصلی مطلب حاصل ہو جائے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین !!

باب دوم

تعلیمی حالت

مسٹر جے۔ آر۔ راصاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ عہد مغلیہ میں کالج اور درسگاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا تقریباً ۱۶۹۰ء میں کپتان ہملٹن خلیج فارس سے ہوتے ہوئے ساحل ہندوستان پر آئے ہیں سب سے پہلے انہوں نے اس حصہ ہندوستان کو دیکھا ہے جو سندھ کے نام سے موسوم ہے۔ سندھ میں ایک شہر تھا جس کا نام "ٹھٹہ" تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو ان کی پہلی نظر آیا وہ لکھتے ہیں۔

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کیلئے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لیے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں۔" جلد اول صفحہ ۱۲۷

اگر ایک سندھ کے ساحل کی یہ حالت تھی تو اس زمانہ میں پایۂ تخت کے قریب قریب شہروں کی تعلیمی نظر سے کیا حالت ہوگی۔ اسکا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے اصلیت یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم کا نقطہ نظر ہی زمانۂ موجودہ سے علیحدہ تہا۔ اور اس کے طریقے جدا تھے۔ پڑہانا ایک ایسا نیک کام خیال کیا جاتا تھا کہ اس کا معاوضہ ہی نہیں ہوسکتا تہا۔ اُستاد کا درجہ والدین سے کم نہ تھا۔ پڑہانا ایک معزز پیشہ تہا۔ بہت سے لوگ اس کو باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور اس کام کو خوشی سے انجام دیتے تہے اور آجتک اسی کا یہ اثر ہے کہ جب ہم لفظ "مولوی" کسی کے نام ساتھ سنتے ہیں تو دل میں وقار و عزت کے خیالات آجاتے ہیں علاوہ بریں ہر رئیس محلہ کے لئے اپنے دروازے پر ایک

مکتب کا قایم کرنا ویسا ہی اُسکی ریاست کے لوازمات میں سے تہا جیسا کہ گھوڑے ہاتھی کا پالنا یا گرمذہبی رسم ورواج کی پابندی کرنا۔ اس مکتب میں نہ صرف اُس رئیس ہی کے بچے پڑہتے تھے بلکہ تمام غریب اہل محلّہ کے بچے مولوی صاحب کے پاس پڑہنے کے لئے بٹہائے جاتے تھے۔ نقد کی صورت میں مولوی صاحب کو بہت کم ملتا تھا۔ مگر اسطرح بہت سے لڑکے پڑھ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نہ صرف پڑہاتے تھے بلکہ آداب بھی سکہاتے تھے۔ اگر لڑکے نے ذراسی بدتہذیبی کی تو ماں باپ بھی مولوی صاحب کے حوالہ سے بچہ کو ڈراتے تھے۔ لڑکے کے کیرکٹر درست کرنے میں انکو بہت دخل تھا۔ ہم اس زمانہ کے اسکول اور کالجوں کے خلاف نہیں ہیں لیکن ہماری رائے میں اس ملک کے واسطے ابتدائی تعلیم گاہوں کا مکتب کی صورت میں ہونا بہترین طریقہ تھا۔ افسوس کہ رفتار زمانہ نے اس قسم کے مولویوں اور مدرسین کا طبقہ ہی نیست ونابود کردیا۔ مکتبوں کے تعداد کی جو حالت بچشم خود میں نے بچپن میں اپنے چھوٹے سے قصبہ امیٹھی میں دیکھی ہے اس سے میں قیاس کرسکتا ہوں کہ ملک میں انکی مجموعی تعداد موجودہ پرائمری اسکولوں سے کم نہ ہوگی۔ اس قصبہ امیٹھی میں ایک ویرانہ سنسان مقام ہے جہاں کچھ عرصہ ہوا چند بلا سقف صرف دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اور اب توشاید صرف بنیاد کے نشان باقی رہگئے ہیں۔ پرانے لوگ اسی کو وہ مقام بتلاتے ہیں جہاں طلباء دور دراز فاصلہ سے آکر قیام کرتے تھے اور مُلّا جیون مرحوم جن کو ایک زمانہ تک اورنگ زیب کے اُستاد ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا تھا درس دیا کرتے تھے یہ اس قصبہ کے ان کھنڈروں میں سے ہے جسکو ہم لوگ اہل قصبہ حسرت کی نگاہ

سے دیکھا کرتے ہیں۔ ہم اس کو اپنے قصبہ کا پرانا کالج سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کے مکتبوں اور کالجوں میں ہندو مسلمان لڑکے یکجا پڑھا کرتے تھے۔ یہیں پر ان دونوں مذاہب کے بچوں میں دوستی کے وہ استوار رشتے قائم ہوتے تھے جن کو آئندہ توڑنا دشوار ہوتا تھا۔ ان مکتبوں کے علاوہ جہاں عام تعلیم دیجاتی تھی مذہبی درسگاہیں بھی تھیں۔ مثلاً ہندو پاٹ شالہ یا کسی پیر طریقت یا حافظ جی کا قیام گاہ۔ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں صرف ایک مقام "ٹھٹہ" میں جو چار سو کالجوں کا ذکر کیا ہے غالباً وہ ایسے ہی مکتب، مدرسے اور کالج ہونگے۔ جن کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اور جب کہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت کی یہ حالت ہو تو مسٹر جے۔ آر۔ راجپئی کا یہ دعویٰ کہ اُس عہد مغلیہ میں درسگاہوں اور کالجوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔ یا تعلیم کے ذرائع اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موجود نہ تھے۔ میری رائے میں محض بلا ثبوت معلوم ہوتا ہے۔

باب سوم

مذہبی رواداری

مذہبی رواداری کے معاملہ میں کپتان ہملٹن کی رائے کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو پہلے یورپ کی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہیئے۔ کپتان ہملٹن اُس مُلک کے باشندے تھے جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی خانہ جنگیوں نے ہزاروں نہیں بلکہ

لاکھوں بنی نوع کا خون بہا دیا تھا۔ جہاں اُس زمانہ کی رعایا اگر گورنمنٹ وحکومت کے مذہب سے اختلاف کرتی تھی تو رعایا کے واسطے بہت مہلک نتائج پیدا ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء میں بادشاہ فرانس نے یہ حکم دیدیا تھا کہ پیرس میں تمام پروٹسٹنٹ مذہب کی رعایا کا قتل عام کردیا جائے اس عام فرمانِ قضا میں بچے، بوڑھے، مرد وعورت کا کچھ استثناء اور امتیاز نہ تھا۔ بادشاہ نے کٹی ہوئی گردنوں سے خون کے فوارے نکلنے کا نظارہ اپنے مکان سے بیٹھ کر تماشے کے طور پر دیکھا۔ اسی طرح سے جب ولایت میں شاہزادی "میری" Mary جو کہ رومن کیتھولک تھیں تخت نشین ہوئیں تو ایک نوجوان شاہزادی کی ننھی سی خوبصورت گردن پتھر پر رکھواکر اس بنیاد پر کٹوادی کہ وہ پروٹسٹنٹ ہونے کا علانیہ دعویٰ کرتی تھی۔ راجرس Rodgers کے دس بچوں اور بیوی پر رحم نہ کیا گیا۔ بلکہ اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے اُن کو زندہ جلا دیا گیا۔ یورپ میں اُس وقت مذہبی رواداری کی یہی حالت تھی۔ لہذا کپتان ہملٹن کو عہد اورنگ زیب کی مذہبی رواداری دیکھکر عجیب وغریب سماں معلوم ہوا۔ بہت بڑی بات جو کہ اُن کو متحیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں مگر ایک دوسرے سے اس طرح مل جل کر بسر کر رہے ہیں اور وہ مذہبی تعصبات سے اس قدر بری ہیں کہ اُن میں سوائے پوشاک کے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی تھی جس سے اس کا امتیاز ہوسکے کہ اُن کا مذہب کیا ہے۔ ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایک مقام پر شہر ٹھٹھہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے"
"ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے ہیں"
"اور تہواروں کو اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود"
"ہندوؤں کی تھی ۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن انکی بیویوں کو اجازت نہیں ہے"
"کہ شوہروں کے مردے کے ساتھ ستی ہوں" (جلد اول صفحہ ۱۲۷ - ۱۲۸)

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں :-

"صرف بنیوں میں ۸۴ فرقے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کھانا نہیں کھاتے ہیں"
"ہیں لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برہمن ہمیشہ لوگوں کو اسکی ترغیب دیا کرتے"
"کہ دیوتاؤں کے واسطے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجائیں"۔

"پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں کو"
"پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ"
"وہ اسمیں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق"
"اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں۔" (جلد اول صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۳)

یہ سیاح و تاجر جب سورت میں پہنچتا ہے تو وہاں کی مذہبی حالت حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن انہیں کبھی کوئی سخت جھگڑے"
"ان کے اعتقادات و طریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح"
"چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے ۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو"
"تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے"۔ جلد اول صفحہ ۱۶۲

ہم اُن مورخین سے جن کی کتابیں ہم کو اسکول میں پڑہائی گئی تھیں یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ اخلاقی جرم نہ تھا کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات اپنی تاریخ میں نہیں درج کئے۔ کیا وہ لاعلم تھے۔ یا اُن کی سیاسی اغراض اسکی متقاضی تھیں کہ وہ تمام ہندو و مسلمان بچوں کے دِل میں یہ خیال قایم کریں کہ اورنگزیب ایک متعصب مسلمان تھا جس نے ہمیشہ ہندوؤں کا گلا کاٹا۔ یہ وہی خیالات ہیں جو بعض اوقات ہمارے بعض تعلیم یافتہ ہندو برادران وطن کے دلوں میں آتش عداوت کو مشتعل کردیتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی اور وہ جن لوگوں کو لامذہبی کے راستہ پر جاتا دیکھتا تھا ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا تھا مثلاً جب کبھی وہ کسی مسلمان کو خلاف شرع کوئی فعل کرتا دیکھتا تو وہ اُس کو خود اُسی کی شرع کے مطابق سزا دینا فرض سمجھتا تھا۔ ملک دکھن میں اورنگ آباد کے قریب ایک مقام دولت آباد ہے۔ وہاں کی روایت ہے کہ اس عظیم الشان جلیل القدر فقیر منش بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے کلام مجید لکھکر اور ہدیہ سے جو رقم وصول ہوتی تھی اُس کے سرمایہ سے چند گز زمین اُسی مزار کے قدموں کے قریب خریدی تھی جس سے اُس کو روحانی بیعت تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اُسی زمین کو اسکی نعش سپرد کیجائے اُسپر نہ عمارت ہو نہ مقبرہ ہو۔ سبز گہاس کافی ہے۔ اور قبر ایسی بنائی جائے کہ اس کے پیر طریقت کے مزار ہونے سے جو پانی بہے وہ اس بادشاہ کی قبر سے گذرے اُس کے پاس ایک مدرسہ ہو جسمیں بچوں کو کلام مجید کی تعلیم دیجائے۔ میں نے اس مقام کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آجتک اُس وصیت کی پابندی ہو رہی ہے۔ حال میں اعلیحضرت حضور نظام دکھن نے ایک سنگ مرمر کا کٹہرہ

اس قبر کے گرد بنوادیا ہے۔ اس سے اورنگ زیب کی مذہبی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس مذہب کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھا ہوا تھا وہی مذہب اسکو مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا تھا یہی مذہب یہ پکار پکار اس سے کہتا تھا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

(کلام مجید پارہ سوم)

(مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں)

دولت آباد کے جس دامن کوہ پر اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کئے اسی کے نیچے چند قدموں کے فاصلہ پر وہ غارہائے ایلورہ واقع ہیں جہاں بدھ اور ہندو زمانہ کے مذہبی مندروں اور بتوں کی سنگ تراشی دیکھنے کے لئے آج بھی یورپ اور امریکہ کے لوگ آتے ہیں۔ اسی ضلع میں اجنٹہ کے وہ مذہبی غار ہیں جنکی نقاشی دیکھکر اس زمانہ میں بھی ایک فرانسیسی ماہر فن گویا سکتہ میں آگیا۔ اگر اورنگ زیب کا تعصب اس قسم کا ہوتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا تو اسوقت اس کے لئے ان آثار کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن سوائے ذہنی خیال کے اسکا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خود اورنگ زیب ہی نے یا اس کے حکم سے کسی نے ان میں ہاتھ لگایا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ دوسرے مذہب کی رواداری نہ تھی ہر ہندو اپنے مذہب کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ ہر شخص آزاد تھا۔ ہر شخص جو مذہب چاہتا تھا اختیار کر لیتا تھا۔ جب میں ملک دکھن کے قلعہ گولکنڈہ و قلعہ کریم نگر کو دیکھنے گیا تو ایک منظر ایسا دکھائی دیا جس کا اثر میرے دل پر بہت خوشگوار تھا۔ قلعہ گولکنڈہ و کریم نگر

ہندو زمانہ کے ہیں اُنکی چوٹیوں پر ایک ہندو پرستش گاہیں موجود ہیں مسلمانوں نے ان قلعوں کو فتح کرنے کے بعد ہندوؤں کی اِن عبادت گاہوں کو نیست و نابود نہیں کیا۔ ہندو وہاں تیرتھ کیلئے آج بھی جاتے ہیں یہ دیکھکر مجھ کو مسلمانوں کی مذہبی رواداری پر فخر ہوا ایک ہی اللہ کے بندے ایک ہی خدا کی پرستش اس عالم میں کس کس طریقہ سے کررہے ہیں اگر مسلمان اہل ہنود کو اپنی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کیلئے کسی پتھر کو واسطہ قرار دینے کی ضرورت نہیں تو اس زمانہ میں یہ مقصد ان پتھروں کی توڑ پھوڑ سے ہرگز نہ حاصل ہوگا اگر مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر رہنا چاہتے ہیں اگر مسلمان ہند کو اپنی مادر مشفقہ سمجھتے ہیں تو اس زمین میں جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں برادرانہ تعلق اور مذہبی رواداری کا ہونا انکے قیام زندگی کیلئے لازمی ہے۔

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ عہد مغلیہ میں تبلیغ اسلام کبھی نہ گورنمنٹ و حکومت کی شاخ قرار دیگئی نہ مغلیہ بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کبھی اپنا فریضہ سمجھا البتہ یہ اور بات ہے کہ مولویوں کے اثرات اور بعض خدا پرست مسلمانوں کے طرز زندگی سے عوام الناس کے دل متاثر ہوئے اور مذہب اسلام کی سادگی اور اس کی یہ تعلیم کہ خالق کی نظر میں سب انسان برابر ہیں ہندوستان کے باشندوں کے اُس حصہ کو جو ذات پات کی زنجیروں میں گرفتار تھے ایک خوشگوار منظر معلوم ہوا اور خود بادشاہ کا مذہب بھی ایک خاص وقعت رکھتا ہے ان وجوہ سے مسلمانوں کی تعداد میں کسیقدر اضافہ ہوا مگر ہندوستان میں تبلیغ اسلام کبھی اُس باقاعدہ و باضابطہ طریقہ سے نہیں کیگئی جیسے کہ اسوقت مذہب عیسوی کی تبلیغ منسٹریز کرتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کا بیڑا نہیں اُٹھایا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ عہد اورنگ زیب میں مذہبی رواداری کی بابت

رائے قائم کرنے کی غرض سے اپنے موجودہ تمدن کو ذرا گہری نظر سے دیکھئے
اور ہندوستان کے اُن حصص میں جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھے
کسی پُرانے شہر کے پُرانے محلے میں قدم رکھئے خواہ دہلی ہو آگرہ ہو یا لکھنؤ۔ یا
کسی قصبے میں جائیے۔ خواہ ایٹھی ہو' کاکوری ہو' یا جگوا۔ تو کیا نظر آئیگا؟
کہ ایک ہی دیوار کے سایہ میں ان دونوں مذاہب کے لوگ امن و امان سے
پشتہا پشت زندگی بسر کر چکے ہیں اور اسی کا اب بھی یہ اثر ہے کہ ایک ہی
بنیا۔ بزاز۔ حجام۔ مالی۔ لوہار۔ سُنار۔ دونوں کی روزانہ ضروریات
پوری کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے علیحدہ ہٹ کر کوئی سول لائنیں نہیں قائم کیں ایٹھی
میں خاص میرے محلہ کے ہندو بچے میرے والد کو اسی طرح سے چچا یا دادا
کہکر خطاب کرتے تھے۔ جیسے کہ میرا فرض تھا کہ اپنے والد سے ملنے والے
ہندو احباب کو خطاب کروں۔ اگر قدیم سے مذہبی رواداری نہ ہوتی تو اس
تمدن کے بڑے بڑے یہ آثار اسطرح سے آج کیونکر باقی رہتے۔ اس میں شک
نہیں کہ یہ تمدن اب سُرعت سے مٹتا چلا جا رہا ہے۔ جن کے اسباب پر غور کرنے
کا یہ موقع نہیں مگر اب بھی جا بجا اُن لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اِس
مذہبی رواداری کی آب و ہوا میں پوری نشو و نما پائی ہے مجھ کو امید ہے کہ
میرے معظم و مکرم راجہ راجایاں سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ۔ جی
سی۔ آئی۔ ای مجھ کو معاف فرمائیں گے۔ اگر ان کی ایک خانگی تحریر کا ذکر
کر دوں ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں عید الضحیٰ کے موقع پر اپنے اہل اسلام احباب
کو مہاراجہ صاحب ممدوح نے ایک مبارکباد لکھی تھی چنانچہ مجھ کو بھی کمال عنایت سے

یاد فرمایا تھا اُس تحریر کی نقل کرتا ہوں۔

هُوالکل یا معین

خدا کہنے پہ کہتے ہیں نہیں پایا تمائے کہئے
اگر پایا تما کہنا ہو کہتے ہیں خدا کہئے

مری وحدت پرستی پڑ گئی ایسا دیں ضعفے میں
نہیں کچھ کہتے بنتا ہے اگر کہئے تو کیا کہئے

یہ جھگڑے تو چلے ہی جائیں گے ایسا دیں آ
محبوں ہے نوید آمد عید الضحٰی کہئے

میں اپنے جوابی شکریہ کے خط کے چند جملے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"اگر ہندو مسلمان ہندوستان کے دو دریا ہیں تو آپ ان کے سنگم ہیں۔ اگر ہندو
"مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں ہیں تو آپ اُن کا فوکس اور وہ نقطہ ہیں جہاں"
"دونوں کی روشنی مل جاتی ہے۔ افسوس! ہندوستان میں ایسے نفوس کم ہوتے جاتے ہیں"

المختصر مہاراجہ صاحب اس ملک کے قدیم تمدن کے عظیم الشان نمونہ ہیں کیا اختلاف
مذہب ہندو مسلمان میں گہری دوستی قائم ہونے کا کبھی مانع ہوا؟

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ کبھی مانع نہیں ہوا۔

بابو شیو سہائے مرحوم لکھنؤ کے ایک محلہ "عیش باغ" میں رہتے تھے۔ طالب علمی کی
حالت میں انہوں نے ایک کلب قائم کیا تھا جس میں بحیثیت طالب علم میں بھی
شریک ہوا۔ ہماری دوستی کے پینگ اتنے بڑھے کہ ایک ساتھ خورونوش میں
عار نہ رہا۔ جب جون ۱۸۹۴ء میں معلوم ہوا کہ میں امتحان بی۔ اے میں کامیاب

ہو گیا۔ اُس وقت تک بابو شیو سہائے ایل۔ ایل۔ بی پاس کر چکے تھے مثل ایک بڑے
بھائی کے انہوں نے مجھ کو حکم دیا کہ اُسی سال نومبر کے مہینہ میں مجھ کو ایل۔ ایل۔
بی کے امتحان میں شریک ہونا پڑیگا۔ میرا دلی رجحان طبابت و ڈاکٹری
کی طرف تھا لیکن انہوں نے قانون کیلئے مجبور کیا۔ اُس زمانہ کے قواعد کے
بموجب لا لکچرس ایف۔ اے کے ساتھ ساتھ میں نے پورے کر لئے تھے۔ پھر بھی
زمانہ بہت کم تھا علاوہ بریں ایم۔ اے میں بھی شریک تھا۔ طبیعت ہچکچاتی
تھی۔ میں تو کاندھا ڈالے دیتا تھا۔ بابو شیو سہائے نے کہا نہیں تم کو اسی
سال شریک ہونا پڑے گا۔ میں اپنے اس ہندو دوست کی شفقت کو کبھی نہیں
بھولونگا۔ دن دن بھر میرے لئے قانون کی کتابوں کے خلاصے بناتے تھے
مجھے رات کو آکر پڑھاتے تھے۔ ہالینڈ جورسپروڈنس کا مشہور بابو شیو سہائے
کا خلاصہ جو بعد کو انہوں نے طبع کرایا اور جس سے سینکڑوں ایل۔ ایل۔ بی
کے طلباء فیضیاب ہوئے اُن کی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ ۱۷؍ جولائی ۱۸۹۴ء
کو میں نے قانون پڑھنا شروع کیا۔ ۲۶؍ نومبر ۱۸۹۴ء کو امتحان ایل۔ ایل۔ بی
شروع ہوا جب جنوری ۱۸۹۵ء میں میرے پرنسپل مسٹر وھائیٹ نے الہ آباد
یونیورسٹی کے قانونی امتحان کے اشاعتِ نتیجہ کی کمیٹی سے واپس آکر مجھ کو قبل
سے قبل یہ خبر پہنچائی کہ میں اول درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں کامیاب ہوا۔
جب یہ خبر بابو شیو سہائے کے کانوں تک گئی تو ان کی مسرت کا اندازہ سوائے
میرے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بابو شیو سہائے مرحوم ہندو تھے۔ مسلمان نہ تھے
لیکن کیا یہ اختلاف سچی دوستی کا مانع ہوا؟ ان باتوں کے لکھنے سے میرا یہ مقصود

نہیں ہے کہ ہندوستان میں آج کے قبل ہندو مسلمانوں میں مذہبی جھگڑے کبھی نہیں ہوئے بلکہ میرا مقصد صرف اسقدر ہے کہ اس ملک کی عام حالت ہندو مسلمانوں میں مذہبی رواداری کی رہی ہے۔ عام طور سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ امن و اماں کے ساتھ رہتے بستے رہے ہیں۔ یہ ہمارا اصلی تمدن اورنگ زیب کے زمانہ میں تھا اور اب بھی بہت کچھ باقی ہے جس کی نظر سے موجودہ زمانہ کے حالات مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ اصل مضمون سے کسیقدر ہٹ کر عام مذہبی رواداری کے متعلق اظہار رائے کروں۔ اور پہلے میں اُن اہل اسلام سے پوچھتا ہوں جو کہ اپنی زندگی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مندروں کے پاس سے ہوکر گزرے ہیں کہ کیا ان مندروں کو دیکھ کر کبھی بھی کوئی جوش اُن کے دل میں اس قسم کا پیدا ہوا کہ وہ مندر مسمار کردئے جائیں یا اُن کی صورت اُن کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوئی اور اگر ایسا ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں اور اسی طرح اُن اہل ہنود سے بھی پوچھتا ہوں جو ہزاروں مسجدوں کے پاس سے ہوکر روزانہ گذرے ہیں کہ کیا صرف اُن مسجدوں کو دیکھ کر کوئی مذہبی ولولہ اُن کے دل میں پیدا ہوا اور اگر ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری پنج وقتہ اذان اہل ہنود کے لیئے ایک معمولی صدا ہوگئی ہے اسی طرح عام اہل اسلام کو ناقوس صرف ایک ایسی شئے معلوم ہوتی ہے جس میں سے سانس اور ہوا کے زور سے ایک بلند آواز نکلتی ہے اس میں اور عیسائیوں کے کلیسہ کے گھنٹوں میں کیا فرق ہے؟

مسلمانوں کو نہ مندر کی عمارت سے کوئی خاص دشمنی ہے اور نہ ناقوس کی آواز سے کوئی خاص نفرت ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ خدا کے تصور میں ہے پتھر اور مٹی

کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر مسجد و مندر و ناقوس کے جھگڑے بعض اوقات ہیبت ناک صورت میں جا بجا کیوں پیش آجاتے ہیں اور اُن سے وہ ناگوارا اور تکلیف دِہ نتائج کہ جن کا خیال کرنا بھی اہرمن پسند صُلح جو دِل کو رُوح فرسا ہوتا ہے۔ نمودار ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس قسم کے تنازعات کی ابتدا میں اصلی مذہبی جوش کو اسقدر دخل نہیں ہوتا جسقدر اغراض ذاتی اور نفسانیت کو ہوتا ہے جن کی جڑ جہالت و انسانی کمزوریاں ہیں مثلاً بعض اوقات کسی مقام کے چند سربرآوردہ اشخاص میں کوئی خصومت قبل سے چلی آتی ہے محض اسکی بناء پر وہ کسی مذہبی رسم کی انجام دہی کے موقع پر مذہب کی آڑ میں اس طرح کچھ امور پیش کر دیتے ہیں کہ لوگوں کو برانگیختگی ہوتی ہے اور اسکے بعد عام مسلمان اور ہندوؤں کی شرکت اور پارٹی بندی خودداری کے اصول پر شروع ہوتی ہے اور اُسوقت کسی ذاتی خصومت، غرور و خودداری سے وہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو ہم صرف مذہبی جوش پر محمول کرتے ہیں بعض اوقات ہمارے اوہام بھی ایسے تنازعات کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر اہل ہنود نے عشرہ محرم میں مسجد کے قریب باجا بجا دیا یا ناقوس پھونک دیا تو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اُس سے غرض ہماری توہین تھی خواہ دراصل یہ غرض ہو یا نہ ہو شریر النفس لوگ جاگزیں بھی کراتے ہیں کہ توہین کرنا مقصود تھا۔ پھر خودداری کا مادہ مثل باد تند کے اس شعلہ کو بھڑکا دیتا ہے بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب ایک مقام پر ایک ہی وقت دونوں فرقے اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تب چند لوگ ایسے بھی نمودار ہو جاتے ہیں جنکو

مذہبی جوش تو کچھ نہیں ہوتا لیکن لاٹھی، تلوار، اور چھروں کی زور آزمائی میں لطف آتا ہے۔ یہ تو عام صورتیں ہیں کہیں کہیں شاذ و نادر مذہبی جوش کو بھی دخل ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یہ عام صورتیں ایسی نہیں ہیں کہ اس ملک میں مذہبی رواداری قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ہندوستانی قوم کا دائمی تسلط لازمی ہو۔ یہ عام صورتیں انسانی خلقت اور کمزوریوں کے وہ شعلے اور چنگاریاں ہیں جو ہر ملک میں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں نکلا کرتی ہیں اور جب تک انسان باقی ہے نکلا کریں گی ان کا انسداد بہت کچھ حکومت کی انتظامی قابلیت پر منحصر ہے اور ان کو مذہب سے اسقدر تعلق نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ آج ایسا کون ملک ہے جہاں انسانوں کے جذبات سے بعض اوقات خونریزی کے نتائج نہیں پیدا ہو جاتے اگر ہندوستان میں کبھی کبھی مذہبی جھگڑے ان کے باعث ہوا کرتے ہیں تو یورپ کے ممالک میں آئے دن کی ہڑتال اور سیاسی امور میں اختلاف رائے اسی قسم کے فسادات کے موجب ہو جاتے ہیں ایسے ممالک جیسے جرمنی، یونان، اٹلی فرانس، آئرلینڈ، وانگلستان میں بھی وقتاً فوقتاً ان جذبات کے اظہار میں ایک دوسرے کا سر توڑنے پر لوگ آمادہ ہو جاتے ہیں جس ملک کی آبادی تخمیناً ۳۲ کروڑ ہو اس میں کبھی کبھی کہیں کہیں جھگڑوں کا پیش آنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی فرمایا ہے۔ اس کا خوف نہ کرنا چاہیے کہ برٹش انڈیا میں بحالت خود مختاری ہندو مسلمانوں کو ہضم کر جائیں گے یا مسلمان ہندوؤں کے مذاہب کو نیست و نابود کر دیں گے۔ جب کئی سو برس کی اسلامی حکومت

یہ نہ کرسکی تو پھر اس صدی کے مسلمان کیا کریں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے تنازعات کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں ہے اور ان کا انسداد کافی انتظام سے ہوسکتا ہے۔

اے بھائیو! گزشتہ صدیوں میں اپنی انتظامی قابلیت سے تم اس قسم کے تنازعات کا سدباب کرتے رہے ہو اور آئندہ بھی کرسکو گے۔

اگر مجموعی حیثیت پر غور کیا جاوے تو ہندوستان کی بڑی بڑی دیسی ریاستوں میں مذہبی رواداری برٹش انڈیا سے کم نہیں ہے اور اس قسم کے تنازعات کو رفع کرنے میں اُن کی انتظامی قابلیت کسی طرح برٹش انڈیا کے حکمرانوں سے کم نہیں ہے۔

اے برادرانِ وطن! مایوس نہ ہو۔ مجموعی حیثیت سے تم میں مذہبی رواداری کا کافی مادہ اب بھی موجود ہے۔

باب چہارم ۲۰

تجارت و تمول و فارغ البالی

اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کی تجارت و تمول و فارغ البالی کی جو حالت تھی اُس کا حال پڑھکر ہم کو اپنے موجودہ افلاس پر افسوس معلوم ہوتا ہے جبکہ کروڑوں بنی نوع انسان کو سوائے ایک وقت کے دوسرے وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے اورنگ زیب کے زمانہ میں تجارت سے دوطرفہ تمول بڑھتا تھا۔ باہمی تجارت کرنے والے دونوں ملک دولت سے مالامال ہوتے تھے۔ ہندوستان کا بیشمار مال ولایت، پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کو جایا کرتا تھا اور اسی طرح سے اُن ممالک کے لوگ ہندوستان کو مال بھیجتے تھے۔ اس باہمی مساوات سے اس ملک کے تجار کی یہ حالت تھی کہ کپتان ہملٹن ایک مقام پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے جس کا سرمایہ تجارتی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی کل تجارت و سرمایہ کے برابر ہے۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال میں مال کے تقریباً (۲۰) جہاز بھر کر وہ بھیجتا ہے ہر ایک جہاز ۳۰۰ سے لیکر ۸۰۰ ٹن کا تھا۔ اور ہر ایک میں صرف اُسی کا مال دس ہزار پونڈ" "اور بعضوں میں ۲۵۰۰۰ پونڈ کا تھا۔ اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تھا" "تب بھی اُس سے زیادہ مال اس کے پاس آئندہ کے لیے باقی رہتا تھا"

جلد اول صفحہ ۱۴۷-۱۴۸

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس بڑے بڑے عمدہ جہاز ہیں جو

ہندوستانی انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر بہ حیثیت کپتان اور میٹ ملازم رکھتے ہیں۔
(جلد اوّل صفحہ ۲۳۳)

ملابار کے کنارے پر ایک قوم آباد تھی جو غالباً اب "ماپلا" کے نام سے مشہور ہے اسکی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ یوروپ کے براعظم کو مچھلیاں بھیجتے ہیں عام طور سے لوگ ہندوستان سے لوہا قیمتی جواہرات وچوبینہ بھیجا کرتے تھے ایک قسم کا رنگ بھی بھیجا جاتا تھا جس سے چھینٹ ایسی خوبصورت چھپتی تھی کہ بقول ہملٹن دنیا میں کہیں کا رنگ اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے خود بھی میسور کے عجائب خانہ میں ہندوستان کی پرانی چھینٹ دیکھی ہے جو مکھن اس ملک سے جایا کرتا تھا اسکی نسبت بھی کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یورپ میں اس سے بہتر ذائقہ کا مکھن دستیاب ہونا دشوار تھا۔

ہندوستان کا کپڑا ایسا عمدہ ہوتا تھا کہ اسکی مانگ نہ صرف ولایت میں تھی بلکہ ایسے مقامات پر بھی تھی جیسے پیگو وسماٹرا وغیرہ
(جلد اول صفحہ ۲۹۶ - ۳۵۰)

جنوبی ہند کے بڑے بڑے ہندو راجہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ساحل ہندوستان کے جنوبی حصہ سے جب کپتان صاحب کا جہاز گذرا تو ان کو ایک مقام پر خفیف سا ٹیکس راجہ صاحب کو ادا کرنا پڑا جب کپتان صاحب راجہ صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور غالباً ٹیکس کی شکایت کی تو راجہ نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے فرض کرو کہ غیر اقوام کے لوگ ولایت بغرض تجارت جائیں تو ان سے بھی وہاں ٹیکس لیا جائے گا۔ علاوہ بریں ہم لوگ تمہاری جان ومال کی حفاظت کے

ذمہ دار ہیں لہٰذا ایسا خفیف سا ٹیکس لینا ایک واجبی بات ہے۔

(جلد اوّل صفحہ ۲۹۹)

شاہی ٹیکس جو تجار کو دینا پڑتا تھا وہ بھی بہت کم تھا۔ تجارتی مال پر مسلمانوں سے (۲) فیصدی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اور عیسائیوں سے (۳) یا (۳½) فیصدی لیکن مسلمانوں کو ایک اور دوسرا ٹیکس بھی اپنے مال پر دینا پڑتا تھا جو (۵) فیصدی تھا۔ کپتان ہملٹن صاحب نے اسکو "پال ٹیکس" لکھا ہے۔ یہ پال ٹیکس عیسائیوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے ٹیکس کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کیجاتی تھی۔ مزید برآں انگلستان کے تجار پر ابتداءً اسقدر اعتبار کیا جاتا تھا کہ جب وہ مال ساحل ہندوستان پر اتارتے تھے تو فوراً کوئی محصول ان سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ آخر سال میں جسقدر مال واقعی فروخت ہوتا تھا۔ اُس پر انہیں کے خیالی عمل پر اعتبار کرکے محصول لیا جاتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اِس معاملہ میں زیادہ دیانت سے کام نہیں لیا جسکی وجہ سے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جو اسوقت رائج ہے یعنے جوں ہی مال سرزمین ہندوستان پر اتارا جاتا تھا اس پر محصول کا حساب لگا لیا جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے موقع پر اُس خط وکتابت کی نقل کریں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور گورنمنٹ مغلیہ کے سورت کے گورنر کے مابین ٹیکس کے معاملہ میں ہوئی ہے اُسی سلسلہ میں ہم یہ بھی دکھلائیں گے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں گورنمنٹ نے تجار کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسقدر اپنے ذمہ لے لی تھی کہ اگر اُن کا مال چوری جاتا تو گورنمنٹ خزانہ شاہی سے نقصان کی تلافی کردیتی تھی

اسمیں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی اور احمدآباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی۔

ملاحظہ ہو (جلد اول صفحہ ۱۴۸)

بنگال میں صرف دریائے ہوگلی سے (۵۰ یا ۶۰) جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لئے بیرون ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایک ایک ہزار میل کے فاصلہ سے یہ مال کشتیوں پر لایا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر افیون، مرچ، سونٹھ تمباکو اور کپڑا ہوتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ ۲۱)

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ تمام ساحلِ ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۴۵)

آج وہ ہمارے تجارتی جہاز کہاں چلے گئے۔ آج جب کونسل میں تجویز پیش کیجاتی ہے کہ ہندوستانیوں کو جہازی بیڑہ تیار کرنے کی اجازت ہو اور یہ کہ اُن کو جہازرانی سکھلانا چاہیے تو دبی زبان میں انکو ناقابل کہا جاتا ہے لیکن افسوس ہے ہماری گزشتہ تواریخ پر نظر نہیں ڈالی جاتی ہم صرف بھولا ہوا سبق یاد کرنا چاہتے ہیں اگر ہم سبق بھولنے کے وجوہ بیان کرنے بیٹھیں گے تو یہ کام بہت رنج دِہ و ملال انگیز ہوگا۔

یہاں تک تو اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت اور تمول کا بیان

کیا گیا ہے اب اہل ہند کی فارغ البالی کا حال سنئے اگر اشیاء مایحتاج کی ارزانی اور لوگوں کی خوش حالی و فارغ البالی کسی حکومت کی کامیابی کا ثبوت قرار دیجاسکتی ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستانی رعایا بہت فارغ البال و خوشحال تھی۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بیف (گائے کا گوشت) تین فارذنگ یعنے کچھ کوڑیوں کو نصف سیر ملتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۱۶۱)

ایک ٹن یعنے کئی من نمک ایک کراؤن میں فروخت ہوتا تھا۔ جو کہ غالباً دو یا ڈھائی روپیہ کے برابر ہوتا تھا (جلد اول صفحہ ۲۵۵)

ساحل کارومنڈل کے کنارے ساڑھے تین آنہ میں ۲۰ پونڈ مچھلی جو کہ ذائقہ میں ٹراؤٹ اور سامن کے برابر ہوتی تھی ملتی تھی۔

(جلد اول صفحہ ۲۷۹)

شہر کٹک میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ یعنے نصف سیر ملا کرتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

دو آنہ میں ایک سو مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں جو کہ اتنی اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان میں کی صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوتی تھیں

شہر ڈھاکہ میں اشیاء مایحتاج اس کثرت سے اور اس قدر ارزاں و سستیاب ہوتی تھیں کہ اسوقت اس کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ملک بجد آباد تھا"

(جلد دوم صفحہ ۲۳)

"میں نے ایک ایسے قابل اعتبار شخص سے سنا ہے ۔جس نے کہ موسم سرما میں وہاں زندگی بسر کی ہے کہ پانچ سو اسی (۵۰۰) پونڈ چاول ایک روپیہ میں ملتا ہے"

(جلد دوم صفحہ ۲۵)

ہرن، بارہ سنگھے، مور، اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے گھروں میں بلا خوف وخطر آجاتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۲۴)

احمد آباد ۔دولت ۔ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا ۔صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو (۱۶۲۵۰۰) پاؤنڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے ۔کپتان ہملٹن عہد اورنگ زیب کی بابتہ اپنی عینی شہادت دیتے ہیں کہ ہند میں یہ ترقی وثروت تھی۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۶)

*

کیا آج تمام یورپ کے بڑے بڑے مدبر اس میں متفق الرائے نہیں ہیں کہ ہر گورنمنٹ کی کامیابی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جو خدا کے بندے اسکے زیر حکومت ہوں وہ ننگے اور بھوکے نہ رہیں اسکی زیر حکومت ہر متنفس کو اگر پیٹ بھر کھانا پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان مل جائے تو گورنمنٹ کی اصلی غرض حاصل ہو جاتی ہے ۔آج اگر تہذیب وتمدن کی صرف سطح ظاہر پر نظر ڈالی جائے تو وہ کچھ ایسا عظیم الشان اور درخشاں نظر آئیگا کہ دیکھنے والے کی نظر خیرگی کرگی اور ایسا دلفریب خوبصورت دکھائی دیگا کہ دل لہلوٹ ہو جائے گا ۔مگر جب بہ نظر تحقیق اس کی تہ کو دیکھا جائے تو یہ پتہ ملیگا کہ ہر یوروپین سلطنت اپنی رعایا کی صرف خورونوش کے انتظام میں منہمک ہے ۔ولایت میں لیبر گورنمنٹ اسی مسلح

* نظارہ اس کثرت سے بار بار آیا کہ ہم بمبئی اور ولایت کے ہر ایک ... روزنامہ ... مضمون نگار ...

کو حل کر رہی ہے۔ مجھ کو تو ۱۹۲۴ء کے یورپ کے سفر میں یہ محسوس ہوا کہ اس وقت یورپ کے باشندے روپیہ پیدا کرنیکی دُھن میں ہیں نہ حق و ناحق کی پروا ہے نہ واجب و ناواجب کا کچھ لحاظ، خصوصاً وہ جب کسی اجنبی سے معاملہ کرتے ہیں۔ خیر سفر میں میری یہ نظر تو سرسری تھی مگر کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کے باشندے اپنی زیست کے اسباب فراہم کرنے میں اسقدر حیران و پریشان نہ تھے جیسا کہ آج نظر آرہے ہیں بلکہ دنیا کے اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ان کی تجارت، دولت، ثروت اور فارغ البالی یورپ کے ممالک سے اس زمانہ میں اگر بڑھی چڑھی نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ موجودہ افلاس کو عہد اورنگ زیب کی خوشحالی سے مقابلہ کیجیے اور پھر لوگوں کی فارغ البالی کا فیصلہ کرے۔

باب پنجم

انصاف و امن و امان

ہر حکومت کا دار و مدار انصاف پر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہادیٔ برحق رسولِ خدا کا آب زر سے لکھنے کے قابل یہ ارشاد ہے کہ انصاف و کفر کے ساتھ سلطنت کی بقاء ممکن ہے مگر ظلم و اسلام کے ساتھ وہ ہرگز باقی نہ رہیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اسلامی سلطنت اپنی رعایا کے ساتھ عام اس سے کہ وہ مسلمان یا غیر مسلمان کوئی ہوں یکساں انصاف کرنا بقائے سلطنت کا موجب سمجھتی آئی ہے اور شرع اسلام میں قضا کو حکم

کہ مابین مسلم وغیر مسلم بھی وہ یہی فیصلہ کریں جو مقتضائے نصفت وعدالت ہو۔ انصاف وہ مقدس عمل بلکہ عبادت ہے کہ جس کی بجا آوری میں ذات پات اور مذہب کو کچھ دخل نہ ہونا چاہئیے۔ انصاف صرف سلاطین اور قضاۃ ہی کا فرض نہیں ہے بلکہ ہر شخص پر واجب ہے کہ ایک دوسرے سے انصاف کرے اور انصاف چاہے اور جب تک انصاف نہ ہو انسانوں کا ایک ساتھ مل جلکر رہنا غیر ممکن ہے انصاف ہر سوسائٹی کی جان ہے۔ اگر کسی تمدن میں انسانوں کے دل سے ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری وحفاظت کا خیال نکال ڈالا جاوے تو وہ تمدن ایک دم سے درہم برہم ہو جائے گا یوں تو انصاف رواداری اور حسن سلوک کی ہر ملک اور قوم کو ضرورت ہے لیکن ہر تمدن میں انسانوں کے باہمی حقوق کا تخیل و تصور مقامی عادات ورسم ورواج کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ انصاف کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے اور جب ہر قوم کے خیال کے مطابق انصاف ہوتا ہے تو وہ اسکو انصاف سمجھتے ہیں ورنہ ظلم۔ چاہے حاکم نے اپنی سمجھ میں کیسا ہی واجب اور درست عمل کیا ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ دو ہزار برس قبل ہندوزمانہ کا ایک خاص نوع کا تمدن تھا اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اہل ہند کی خاص ضرورتیں اسوقت کے خیالات کے تعلق سے تھیں انھوں نے پیشوں کی تقسیم کر دی تھی اور شادی وغمی و معاشرت حتیٰ کہ خور ونوش کے معاملہ میں ذات برادری کی آہنی دیواروں سے انسانوں کی تقسیم مختلف طبقات میں اسطرح کر دی تھی کہ اگر ہندوزمانہ کے کسی منصف سے یہ کہا جاتا کہ معاملات کے فیصل کرنے میں اس خاص تمدن کے تصور کو ذہن سے مثلاً ایسے امر میں نکال ڈالے کہ اگر کوئی نائر یا چھوت والے شودر نے

کسی برہمن کو چھو لیا ہے تو وہ کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تو غالبًا وہ منصف انصاف کے اس تصور پر تمسخر کی نگاہ سے دیکھے گا یہ ہندؤں کی کیفیت اُن کے ابتدائی تمدن میں تھی اس کے بعد جب مسلمانوں کا تمدن آیا اس نے ہند کے تمدن میں کچھ نئے عنصر داخل کئے جنکی وجہ سے انسانوں کے خیالات اور ضرورتیں بدل گئیں اور ہند کے باشندوں میں وہ خلط ملط شروع ہو گیا جو کہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نئے تمدن نے انصاف کے تصور و تخیل کو بھی بدل دیا لہذا جب ہم کسی ملک کے انصاف رسانی کے طریقوں پر واجبیت یا نا واجبیت کا فتوےٰ دینے بیٹھیں تو انصاف یہی ہے کہ ہم اُس زمانہ کے تمدن و ضرورتوں کو پیش نظر رکھیں اس لئے جو انصاف عہد اورنگ زیب میں تھا اس کے متعلق فتوےٰ دیتے وقت ہم کو بھی اُصول پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنے وہ تمدن کونسا تھا اور اُس زمانہ کی ضرورتیں کیا تھیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں گو کہ ڈاک کا انتظام اس حد تک کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کے دُور دُور مقام سے دہلی تک خطوط پہنچنے میں صرف آٹھ یوم صرف ہوتے تھے۔ اور ہر پانچ میل کے فاصلہ پر ہرکارے بدل دئے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۹)

پھر بھی ریل نہ تھی، تار نہ تھا، سڑکیں اس حالت میں نہ تھیں جیسی کہ آج ہیں انسان اُس حد تک خلط ملط نہیں ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان ہملٹن نے اکثر مقامات پر جو تصویر اُن سزاؤں کی کھینچی ہے جو کہ قاتلوں یا

ڈاکوؤں کو دی جاتی تھیں وہ آج ہم کو ہیبت ناک معلوم ہو رہی ہیں مگر اس زمانہ کے حالات اور ضرورتوں کے لحاظ سے وہ کچھ بھی ناواجبی نہیں تھیں۔ کپتان ہملٹن نے اُس زمانہ کی عدالتوں کا پورا دستور العمل یا تنظیم ہم کو نہیں بتلائی۔ البتہ سورت کے قاضی کی بابتہ یہ لکھا ہے کہ وہ راشی تھا اور اکثر زر ڈگری ہیں (مدعیہ) فیصدی اپنا حصہ لیتا تھا اور امیر و دولتمند غربا کے مقابلہ میں اکثر بازی لے جاتے تھے ممکن ہے کہ سورت کے قاضی کی یہی حالت ہو جس سے آج بھی دنیا خالی نہیں ہے مگر ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے انصاف کی کیا حالت تھی انصاف رسانی کا پورا انتظام تھا یا نہ تھا۔ اس کا بہترین معیار یہ ہوگا کہ ملک کی اندرونی حالت پر نظر ڈالی جائے۔ کیا وہ نشانات و اثرات بخوبی نمودار تھے جو انصاف سے عموماً پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کیا اہل ہند دنیا کے کاروبار کو باطمینان تمام چلاتے تھے اگر مذہبی رواداری اس قسم کی تھی جسکا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ملک میں تجارت و تمول و فارغ البالی و صنعت و حرفت ویسی ہی پائی جاتی تھی جیسا بیان ہوا تو پھر یہ کہنا دشوار ہے کہ عہد اورنگ زیب میں انصاف نہ تھا۔ یہ ثمرات اور نتائج بلا امن و امان و عدل و انصاف کبھی کسی ملک کو میسر نہیں ہوتے ہیں۔ عہد اورنگ زیب کی یہ جو کچھ حالت لکھی گئی ہے یقیناً اس عہد کے امن و امان اور عدل و انصاف کے ہی بدولت تھی۔ کیا ایک درخت میں سیب کا پھل لگا ہوا دیکھکر پھر بھی یہ کہنا کہ یہ درخت سیب کا نہیں ہے انصاف ہوگا؟

کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں انصاف کا چشمہ سکون کے ساتھ جاری ہے اور گو کہ اس چشمہ کے صاف و شفاف

دھارے کو بعض اوقات رشوت کے خس و خاشاک مکدر اور گدلا کر دیتے ہیں مگر اُس عہد کی مجموعی حالت انصاف کا فیصلہ اس نقاد سیاح نے پر معنی فقرے سے کیا ہے۔

"لیکن سیاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ
"گورے چمڑے والوں میں ہے" (جلد اول صفحہ ۱۸ دیباچہ)

اس موقع پر گورے چمڑے والوں کی رشوت ستانی و مظالم کے کچھ حالات بیان کئے بغیر شاید عہد اورنگ زیب کے زمانہ کی قدر اور اُس عہد کے انصاف کا پورا اندازہ ناظرین کو نہ ہو سکے۔ لہٰذا کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:۔

ایک شخص مسٹر ولڈن Mr. Weldon نامی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات طے کرنے کے لئے انگلستان سے ہندوستان بھیجا گیا تھا اِس کے چال چلن کے متعلق کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں:۔

"اُس کا زمانہ گورنری بہت مختصر سا تھا۔ لیکن اُس میں بھی اس نے لوگوں کو تنگ
"کر کے اپنا خزانہ بھرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اُس کے مظالم کی ایک خاص مثال
"یہ ہے کہ"

ایک غریب ملاح کی ایک خوبصورت بیوی تھی جو اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں
"کبھی کبھی کچھ بدعنوانیاں بھی کر گذرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس عورت نے دو آرمینیوں
"کو اپنے یہاں بلایا۔ اُن میں اس عورت کے تعلق سے رقابت ہوگئی۔ شدہ شدہ"
"اُسکی خبر گورنر کے کان تک پہنچی۔ اس نے پہلے تو ان دونوں کو طلب کر کے کچھ"

"سرزنش کی لیکن جب انہیں ت ایک نے گورنر کے ہاتھ میں پانچ سو روپیہ رکھ دئے"
"تو اس کو بلا شرکت غیرے اس عورت کا مالک بنا دیا اور وہ اس کو لیکر ہو گلی"
"چل دیا۔ یہ شخص علانیہ کہا پھرتا تھا کہ اس سودے میں اسکو کیا خرچ کرنا پڑا اور وہ"
"اس گورنر کا بڑا مداح تھا۔ جب اس عورت کا بے چارہ شوہر واپس آیا تو اس کو بیوی"
"کی فرقت پر مجبوراً صبر کرنا پڑا بایں ہمہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا اس گورنر کو رشوت"
"لینے میں کچھ شرم دامنگیر تھی یا اندیشہ مانع ہوتا تھا اسلئے اس نے یہ طریقہ اختیار کر"
"کیا تھا کہ جو لوگ اس قسم کے معاملہ کے واسطے اس کے پاس آیا کرتے تھے ان سے"
"کہدیا کرتا تھا کہ میم صاحب اور بابا لوگ سے بات کرو اور اسکی بیوی اور اسکی لڑکی"
"نہایت عمدگی کے ساتھ بڑی بڑی رقمیں ٹہرالیتی تھیں اور روپیہ انہیں کے ہاتھوں سے"
"سے پہنچتا ہیں یہاں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر اس قسم کی جبریہ ثبوت رسانی"
"کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں مگر پرانے زخموں کی پوست کنی نہیں چاہیئے"

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے انصاف کا عالم تھا۔ یہ مشتے از خروارے ہے اس قسم کے بہت سے واقعات کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔ اب اورنگ زیب کا جو انتظام امن و امان و انصاف کے متعلق تھا اس کی بابتہ کپتان ہملٹن صاحب کی رائے کو ملاحظہ فرمائے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اس ملک کی رعایا فرامین کی اسقدر پابندی کرتی ہے کہ ڈاکہ و قتل کی خبریں بہت کم"
"سنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں کہیں چلا جاوے۔ کوئی یہ بھی نہیں"
"پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اور کیوں جاتا ہے" (جلد اول صفحہ ۲۷۹)

پھر بھی کہا جاتا ہے کہ فرامین شاہی کی کوئی پرواہ نہ کرتا تھا اس امن و امان کا مقابلہ اُس بدامنی وظلم وستم سے کیجئے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں نے ہندوستان کے اُس خطۂ زمین پر پھیلا رکھی تھی جس کو بغرض تجارت شاہان مغلیہ نے اُس کو سپرد کر رکھا تھا۔ جس کا مفصل بیان باب نہم (۹) میں کیا جائے گا۔

مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب لکھتے ہیں کہ سمندر پر قزاقوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسکی ذمہ داری عہد مغلیہ کے انتظام پر عائد کیجائے ذرا یہ تو دیکھ لیا جاتا کہ یہ قزاق کون تھے۔ اور کیونکر اُن کو قزاقی کا موقع ملتا تھا حقیقت یہ ہے کہ قزاق مخصوص ہندوستان کے ساحل کے نہ تھے بلکہ اُس زمانہ میں ولایت سے لیکر ہندوستان تک و نیز دیگر مقامات کے سمندر پر چند لوگوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا انہیں کو" پائی ریٹس" (Pirates) کہتے تھے۔ کپتان ہملٹن نے ان کا ذکر بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے افسر بھی بعض اوقات راہ میں قزاق بن جایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی تجارتی مال راستہ میں مل جاتا لوٹ لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۶)

ایک انگریز مسمی کپتان گرین "Captan Green" یہ ڈینگ مارا کرتا تھا کہ جسقدر مختصر سامان لیکر وہ انگلستان سے روانہ ہوا تھا اُس بے سروسامانی سے یہاں آنے کی شاید کسی شخص کی بھی ہمت نہ ہوئی ہوگی وہ بحری قزاقوں سے تجارت کیا کرتا تھا اور راستہ میں جو جہاز اسکو مل جاتا تھا اس کو لوٹ کر وہیں ڈوبا بھی دیتا تھا۔ اور اسی طرح سے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۷-۲۱۸)

میں نے تجارت کے باب چہارم کے سلسلہ میں دکھلایا ہے کہ اُس وقت اہل ہند یورپ تک تجارت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ قزاق بعض وقت راستے میں ہندی و دیگر جہاز لوٹ لیتے ہوں جیسا کہ ہملٹن کے سفرنامہ کی جلد اول صفحہ ۲۱۸ سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اورنگ زیب اس غارتگری کے انسداد کا انتظام نہیں کرتا تھا۔ اول تو ایسا انسداد اُس زمانہ کے حالات کی نظر سے صرف ہند کے سمندر پر انتظام سے ناممکن تھا۔ پھر بھی بادشاہ کے فوجی جہازوں کا بیڑہ "ڈنڈا راجاپور" میں رہتا تھا۔ اس کا کمانڈر سیدی خاں تھا جس کے قبضہ میں (۳۰) یا (۴۰) ہزار آدمیوں کی فوج کا دستہ رہتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۰)

اسلئے یہ کہنا کہ سلطنت ہند کی طرف سے انسداد قزاقی میں بے پروائی کیجاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ رہی کامیابی و ناکامیابی وہ کہاں تک تھی اس کا فیصلہ اس زمانہ کے حالات کی نظر سے کرنا چاہیے خصوصاً جب کہ انسداد قزاقی کی غرض سے اُس کمانڈر کے پاس توپیں بھی تھیں ایک مرتبہ جب ضرورت پڑ گئی تو اسی کمانڈر نے آناً فاناً میں چار بڑی توپیں کروڑگیری کی اس عمارت پر چڑھا دیں تھیں جو کہ بمبئی کے قلعہ سے صرف ۲۰۰ قدم کے فاصلہ پر تھی الغرض رعایا کی پوری طرح سے حفاظت کیجاتی تھی۔ کپتان جان نے بیس پچیس برس کی سیاحت میں صرف ایک موقع کا ذکر اپنے سفرنامہ میں یہ لکھا ہے کہ انہیں سرزمین ہند پر ڈاکوؤں سے اُن کا مقابلہ ہو گیا تھا ایک قافلہ کے ساتھ شہر سورت کیطرف کپتان صاحب موصوف اور اُن کے ہمراہی و ملازمین جا رہے تھے کہ چند قزاقوں کے گروہ نے جو کہ سرحد ہندوستان

کے باہر بلوچستان سے عموماً آیا کرتے تھے قافلہ کو روکنا چاہا۔ کپتان صاحب اور اُن کے ملازمین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کرکے اُن کو بھگا دیا۔ قافلہ پر اس شجاعت کا بڑا اثر ہوا۔ یہ خبر اڑتی اڑتی شہر سورت میں پہنچی کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب اُن کا قافلہ سورت کے قریب پہونچا تو اہالیانِ شہر نے مٹھائیوں اور تحفوں کے ساتھ اُن کا استقبال کیا اور جب کپتان صاحب نے گورنر سورت سے ملاقات کرنی کی خواہش کی تو اس نے چند گھوڑے زیور سے آراستہ و پیراستہ اور ایک باڈی گارڈ استقبال کے لئے روانہ کیا اور جب وہ قریب آئے تو اتنی یہ آؤ بھگت کی کہ خلاف معمول و دستور کپتان صاحب کی سواری کو اپنے خیمے تک آنے کی اجازت دی انکے تمام مال و اسباب کا محصول معاف کردیا اور بنفس نفیس خود فوج کا ایک دستہ لیکر اُن قزاقوں کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوا۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۹)

اس قدر خاطر و مدارات کی غالباً یہ وجہ تھی کہ بقول کپتان صاحب بادشاہ وقت اورنگ زیب کو حفظ امن کا بیحد خیال تھا اور جب کبھی کسی مقام پر اس قسم کے واقعات ہوتے تھے تو اُن کی تمام ذمہ داری صوبہ کے گورنر کے سر ہوتی تھی ایک مرتبہ جب اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی کہ سورت میں ڈاکہ پڑا تو بادشاہ کا حکم بدیں مضمون شرف صدور لایا کہ فوراً شہر کے گرد چار دیواری بنادی جائے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۵)

ایسے واقعات کا یہاں کبھی پیش آنا تعجب خیز نہ تھا اور کس زمانہ میں اور کس ملک میں ایسے واقعات نہیں پیش آتے رہتے ہیں اور یہ زمانہ کب اُن سے خالی ہے

دیکھنا یہ چاہیئے کہ اُس زمانہ میں ملک میں امن و امان کی حالت یہ تھی کہ یہی سیاح تاجر مال و اسباب لیکر سترہ (۱۷) کہاروں کی پالکی میں سوار ساحل و وسط ہند میں برسوں پھرتا رہا مگر سوائے ان دو واقعات کے ہندوستان میں کوئی اور ایسا واقعہ اس کو پیش نہیں آیا جس کو وہ اپنے سفرنامہ میں درج کرتا ملک کی اس اندرونی حالت سے عہد اورنگ زیب میں انصاف و امن و امان کے متعلق رائے قائم کیجا سکتی ہے میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ عہد اورنگ زیب میں تمام عہدہ داروں کا دامن رشوت ستانی کے دھبوں سے پاک و صاف تھا یا کبھی ڈاکہ نہیں پڑتا تھا انصاف کے معاملہ میں جب کبھی دولت و غربت کا مقابلہ ہو جاتا ہے تو یہ حضرت زر مختلف صورتوں میں آج بھی بڑے بڑے کرشمے دکھلاتے ہیں جو لوگ کہ موجودہ مقدمہ بازیوں کی اندرونی حالت سے واقف ہیں وہی اسکا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی روپیہ جھوٹی شہادت کے مہیا کرنے میں اور قانون کی امداد حاصل کرنے میں ایک دولتمند فریق کو کہاں تک مدد دیکر قوی بنا دیتا ہے اور مفلس فریق مخالف کو کیسی کچھ لاچاری اور مجبوری کا سامنا ہوتا ہے اور اسطرح سے یہ حضرت زر آئے دن کیا کچھ انصاف کا خون نہیں کرتے رہتے ہیں۔ رشوت ستانی و ڈاکہ اور چوری اب بھی بند نہیں ہے ہمارے بچوں کو جو تاریخیں مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہیں انہیں ٹھگی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ٹھگی کا انسداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی عہد حکومت میں انیسویں صدی ہی میں کیا گیا تھا اور اس کا فخر کمپنی مذکور کو دیا جاتا ہے مگر ان تاریخوں میں ملک کے اُس امن و امان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا جو کہ قبل کمپنی کی حکومت کے تھا اور جس کا تذکرہ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اصلیت یہ ہے کہ اس

ملک میں ٹھنگی اُسوقت آئی جب کہ حکومتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا جب اس ملک کے باشندوں نے اپنے انگریز حکمرانوں سے یہ کہا کہ عنانِ حکومت پھر اُن کے ہاتھ میں دیدیجائے تو بڑی کشمکش کے بعد اُن کو "ڈائی آرکی" (Diarchy) دیگئی جس کے بموجب ملکی انتظام کا ایک جزو انتخاب شدہ منسٹر یا وزیر کے سپرد ہوا اور دوسرا جزو گورنمنٹ کے سپرد رہا۔ اس طرح سے حکومت کی تقسیم ہوئی اس تقسیم کے دوہی برس میں چل پکار مچ گئی دونوں حصوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ دوہی برس میں بدامنی و بے اطمینانی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "ڈائی آرکی" ناکام ثابت ہوئی اور ہر دور اندیش شخص کہنے لگا کہ "ڈائی آرکی" حکومت کرنے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اب اُس "ڈائی آرکی" پر غور کیجئے جب ہندوستان کی حکومت شاہ مغلیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں میں تقسیم ہوئی تھی ملک کی اسوقت کیا حالت ہو گی جبکہ حکومت کا شعبۂ دیوانی کمپنی کے عہدہ داروں کے قبضہ میں آگیا اور دوسرا شعبہ مالگزاری شاہ مغلیہ کے سپرد رہا ایسے دو متضاد عنصر کا جمع رہنا محال تھا پھر بھی سارا ملک اندازِ نصف صدی اُس عجیب و غریب "ڈائی آرکی" Diarchy کے تہلکہ میں گرفتار رہا۔ ان حالات میں ٹھگیتی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا۔ لیکن جب عنانِ حکومت کلیتاً اس ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی تب ایسی بدامنی یا ٹھگی نہ تھی اس وقت انصاف تھا اور امن و آمان تھا۔

بہ حیثیت قانون پیشہ اودھ کے بہت سے دیہات و تعلقہ جات کی واجب العرض پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا جن میں گاؤں یا تعلقہ کی گذشتہ تاریخ بھی بندوبست اول میں درج کیجاتی تھی مجھ کو اکثر یہ دیکھکر استعجاب ہوا کہ ایک گاؤں یا تعلقہ

پشتہا پشت تک ایک ہی خاندان کی ملکیت وقبضہ میں برقرار رہا یہ بھی دیکھنے میں آیا
کہ جس شخص نے تین سو یا چار سو برس قبل جنگل کاٹکر آباد کیا تھا اسکی اولاد کے قبضہ
میں وہ گاؤں ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی پایا گیا۔ اگر گزشتہ زمانہ میں انصاف و
امن وامان نہ تھا تو کسی گاؤں کی مسلسل تاریخ اسطرح سے کبھی نہ ہوتی ان وجوہ
سے جیسے موجودہ زمانہ کی بابتہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجموعی حیثیت سے انصاف نہیں ہے
یا امن وامان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کیجاتی ہے اسی طرح سے عہد اورنگ زیب
کی بابت یہ کہنا کہ انصاف نہ تھا یا امن وامان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی
تھی انصاف نہ ہوگا۔ یہ عہد اورنگ زیب کے انصاف وامن وامان کے نتائج
تھے جو کہ ملک کی تجارت وتمول وفارغ البالی کے سلسلہ بیان میں ظاہر کئے جاچکے ہیں۔

باب ششم

صنعت وحرفت

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب کسی ملک میں انصاف ہوتا ہے تو امن وامان
ہوتا ہے اور جب لوگ فارغ البال وخوشحال ہوتے ہیں اور جب تلاش معاش سے
کسیقدر بے فکری ہوتی ہے تب ہی انسانی دماغ صنعت وحرفت کی جانب رجوع
ہوتا ہے مفلس قوم دین ودنیا دونوں میں روسیاہ رہتی ہے۔
"الفقر سواد الوجه فی الدارین" میں کوئی شک نہیں جسطرح سے

"پراگندہ روزی پراگندہ دل" کی مثل ایک متنفس پر صادق آتی ہے اسی طرح سے قوم پر بھی صادق آتی ہے اب آپ دیکھئے کہ عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی صنعت وحرفت کی کیا حالت تھی اس سے اس ملک کی خوشحالی کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا اور بکثرت ایسا ملتا تھا جسکی مثال یورپ میں ملنی دشوار تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہاں روئی کا ایک ایسا کپڑا بنا جاتا ہے جو بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے اور اسقدر پائدار کہ ویسا انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں استعمال نہیں کیا۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۵)

غالباً یہ ڈھاکہ کی مشہور ململ ہوگی۔ اس کے علاوہ کمخواب چھینٹ اور سادہ کپڑے بنانے والے اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ صرف ایک شہر ہجا پور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے (۵۰۰۰۰) پچاس ہزار کپڑا بُننے والے جلاہے ملازم رکھ چھوڑے تھے لوگ پوچھیں گے کہ پھر یہ صنعت کہاں غائب ہو گئی۔

جن لوگوں کو اسکی جستجو ہو وہ رمیش چندر دت آئی۔ سی۔ ایس۔ سی آئی۔ ای مرحوم کی کتاب "ہند کی اکنامک ہسٹری" ملاحظہ فرمائیں۔ یہ قابل فخر ہندوستانی ایک زمانہ میں اڑیسہ میں بہ عہدہ کمشنر ممتاز تھے اور پھر لندن کی یونیورسٹی کالج میں تاریخ ہند پر لکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ان سرکاری کاغذات کی مدد سے جو انکی نظر سے گزرے تھے یہ دکھلایا ہے کہ انگلستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے اور اس خوف سے کہ شاید ہندوستان کا کپڑا انگلستان کی منڈیوں تک

قبضہ نہ کر لیوے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار ہندوستان کے نداف اور اُس کی صنعت کو نیست نابود کرنے کی غرض سے مختلف اقسام کی تدابیر استعمال کرتے تھے پہلے کچھ رقم پیشگی دیکر اُن کو ملازم رکھ لیتے تھے اور جو چاہتے تھے وہ کام اُن سے لیتے تھے اگر کسی نے کچھ بھی خلاف معاہدہ کیا تو ٹکٹکی میں باندھ کر بیدوں سے سزا دیتے اور اُنکی انگلیوں کو مختلف اقسام کی ایذا پہنچاتے تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۷۶۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو عام ہدائتیں اپنے عہدہ داروں کے لئے جاری کی تہیں اُن کا پڑھنا بھی تکلیف دہ ہے۔ ہاؤس آف کامنس کمیٹی کے روبرو ۱۸۱۳ء میں جو شہادت تہامس منرو نے دی تھی اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمپنی کے عہدہ داران نداوں کو بھیڑیوں کی طرح سے ایک مقام پر جمع کرکے کھڑا کرتے تھے اور اُن پر پہرہ مقرر کر دیا جاتا تھا کہ جب تک وہ نداف حسب دلخواہ کمپنی معاہدہ پر دستخط نہ کر دیں اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پاویں مسٹر کاکس نے شہادت دی تھی کہ اس طریقہ سے معاہدہ کے پابند جولاہوں کی تعداد صرف اُنکے ایک کارخانہ میں پندرہ سو (۱۵۰۰) تھے کمپنی نے جو قانون ۱۷۹۳ء میں نافذ کیا تہا اور جو ریگولیشن ایکٹ ۱۷۹۳ء کے نام سے موسوم ہے اسکو ملاحظہ کیجئے۔ اس قانون کے بموجب جس پارچہ باف نے کمپنی سے پیشگی رقم لے لی پھر اُس کو یہ حق نہ تہا کہ کسی دوسرے کا کام بنا دے اور اگر کوئی پارچہ باف ایک سے زیادہ کارگاہ اپنے گھر میں رکھے گا تو بڑا تاوان دینا پڑے گا۔ فوجداری میں مقدمہ چلایا جاویگا۔ عہدہ داران کمپنی کو اُن کے مکانوں میں خلاف مرضی داخل ہو جانے کا بہی اختیار دیدیا گیا تہا۔ اِن کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب ۱۷۹۴ء میں صرف (۱۵۶) پونڈ کا ولایتی کپڑا اسالانہ ولایت سے ہندوستان کو آیا تو ۱۸۱۳ء میں

یعنے صرف دس برس کے بعد (۲۷۸۵۶) ستائیس ہزار آٹھ سو چھپن پونڈ کا
مالیتی کپڑا سالانہ ہندوستان کی تن پوشی کے لئے ولایت سے لایا گیا اور ۱۸۳۱ء
میں یعنے تیس برس کے بعد ایک لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو چوبیس (۱۰۸۸۲۴) پونڈ
کا کپڑا سالانہ لایا گیا۔ پھر وہ پارچہ باف یا ان کی صنعت جو عہد اورنگ زیب میں
تھی اب کیسے دکھلائی دے۔ یہ تمام مواد رمیش چندر دت مرحوم کا جمع کیا ہوا ہے
یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور عملاً کمپنی کی حکومت قائم
ہو چکی تھی۔

عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی صنعت پارچہ بافی کو اسقدر عروج تھا کہ ہم
نہ صرف اپنی پوری ضروریات کو ملک ہی کے کپڑے سے پورا کرتے تھے بلکہ غیر ممالک کے
ہاتھ فروخت کر کے اپنی دولت میں اضافہ کیا کرتے تھے۔ یہ تو صرف پارچہ بافی کا ذکر ہوا
عہد اورنگ زیب میں کپتان صاحب ملتان کو بھی گئے تھے تو وہاں اُن کو
بہترین تیر و کمان بنانے والے ملے۔ لوہا بکثرت پایا جاتا کہ جہازوں کے واسطے
لوہے کے لنگر بھی ڈھالے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

کپتان ہملٹن نے گولکنڈے کے ہیروں کا بھی ذکر کیا ہے قاعدہ کلیہ ہے کہ جب
کسی ملک کے تمدن کو عروج ہوتا ہے تو اس کا عکس اس ملک کی عمارات و مکانات پر
بھی اسی طرح پڑا کرتا ہے جیسا کہ ملبوسات پر عیش و عشرت کے یہی سامان ہیں جنہیں انسان
کی طباعی و ذہانت اکثر نمودار ہوا کرتی ہے۔ فن انجنیری کے متعلق تو صرف اس قدر
کہدینا ہی کافی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل ہند آگرہ، و دہلی و لاہور کی وہ خوشنما

عمارتیں مکمل کر چکے تھے جن میں ایک عمارت "تاج بی بی" کا روضہ ہے جو اسوقت بھی عجائبات دنیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عمارات بنانے والے عہد اورنگ زیب میں موجود تھے اور ان کے دماغوں کی جھلک دکھن تک پہونچی تھی۔ دکھن میں جہاں اورنگ زیب کا قیام کچھ عرصہ تک رہا ہے اس کے قرب وجوار کی عمارتیں ملاحظہ ہوں اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی بیٹی کا مقبرہ۔ قلعہ دولت آباد کے نیچے کی وہ مسجد وہ کھنڈر اور وہ منارے ملاحظہ ہوں جہاں اب یورپ کے شکار کے لئے لوگ جاتے ہیں اور جن کو دیکھکر یہ شعر یاد آتا ہے:-

از نقش ونگار در ودیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

خود میرے قصبہ امیٹھی میں ایک مقبرہ ہے جس کے گنبد پر جن میں دور سے چند ٹائلس اس نمونے کے چمکتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جیسے کہ اب یورپ سے مستن ٹائلس آتے ہیں اور جو وہاں کی صناعی کے نمونے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے ہم نے بہت زمانہ ہوا ایجاد کرکے رائج کر دیا تھا۔

اگر اورنگ زیب کے زمانہ کے فن انجنیری کے دوسرے شعبہ کا اندازہ کرنا مقصود ہے تو دکھن میں اورنگ آباد کے قدیم واٹر ورکس کو دیکھئے۔ آج تک لوگ حیران ہیں کہ وہ کونسا چشمہ ہے اور وہ کونسی ترکیب ہے جس کے ذریعہ سے تہ زمین میں بڑے بڑے نالے بنا کر میٹھے پانی کی گویا ندی بہادی ہے جس نے اورنگ آباد کی آبادی کو صرف سیراب ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ باغوں، نہروں، حوضوں اور فواروں سے بہشت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مجھ سے خود اسٹون برج صاحب نے جو سلطنت حیدرآباد دکھن

کے واٹر ورکس کے انجنیر تھے یہ بیان کیا کہ اگر آج ہم اس سے بہتر پانی کا لیول نکالنا چاہیں تو مشکل ہے وہ معترف تھے کہ اورنگ آباد کے لئے اس سے بہتر واٹر ورکس کا انتظام کرنا اس زمانہ میں بھی دشوار ہے۔ اُن کو افسوس تھا کہ فن انجنیری جس نے ایسے واٹر ورکس بنائے تھے ہندوستان سے اب معدوم ہے۔............

.......کیفیت اس خزانۂ آب کی یہ ہے کہ ایک مقام پر صرف ایک بہت عمیق کنواں ہے جس میں جھانکنے سے ایک چشمہ کا چھرا یا سوتا سا نظر آتا ہے۔ یہیں سے ایک گہرا پختہ نالہ بہنا شروع ہوا ہے۔ جوں جوں شہر کیطرف یہ نالہ بڑھتا گیا ہے اُسمیں اُنغاروں پانی نمودار ہوتا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جاکر اس میں سے پختہ نالیاں نکالی گئی ہیں۔ ڈھائی سو برس کے بعد آج بھی انہیں نالیوں سے شہر کو پانی ملتا ہے لیکن اسکی مرمت وصفائی کرنے میں اس زمانہ کے انجنیر بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے محیر العقول واٹر ورکس نہ صرف اورنگ آباد میں تھے بلکہ ہرمیج اس کے آثار بیڑ و بیدر جیسے دور دراز مقامات پر بھی دیکھے ہیں گو کہ وہاں اب وہ اسطرح سے کار آمد نہیں ہیں جیسے کہ اورنگ آباد میں ہیں۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ کا شہر "ٹھٹہ" دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریا سے بذریعہ کینالس اور رہٹوں کے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۱)

کیا یہ تمام واقعات اس کا ثبوت بیّن نہیں ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں صنعت وحرفت اور دوسرے فنون پورے عروج پر تھے۔ کہ اُسوقت غالبًا یورپ کو

ہندوستان سے وہی رشک تھا جو کہ صنعت و حرفت کے مقابلہ میں آج ہندوستان کو یورپ سے ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں دولت برطانیہ کی صنعت و حرفت کی بڑی نمائش جو لندن میں ہوئی اسکی ایک عمارت میں ہندوستانی صنعت و حرفت کے نمونے بھی دکھلائے گئے مجھ سے جب کسی انگریز نے اُن نمونوں کی تعریف کی تو میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اس نمائش کے ہندوستانی سکیشن میں وہ کونسی چیز ہے جس کو ہمارا ہندوستان سو برس قبل نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم کو یہ دکھلاؤ کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہندوستانی دماغوں نے گذشتہ صدی میں پہلے سے زیادہ کیا ترقی کی ہے۔.........

......لکھنؤ کی چکن، فرخ آباد کے پردے، دہلی و آگرہ کا سنگ مرمر کا کام، مُرادآباد کے برتن، کشمیر کی شالیں، یہ سب چیزیں جو اس وقت ہم نمائش میں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ ان سے بہتر نہیں ہیں جو ہم سابقہ صدیوں میں بنا سکتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کشمیر میں اُن سے بھی بہتر پرانی شالوں کے نمونے دیکھے ہیں جن کے فوٹو آج ولایت کے اخبارات میں نمائش کی شہرت دینے کی غرض سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

دیگر ممالک مثل کینیڈا اور اسٹریلیا وغیرہ کا جو سکیشن دولت برطانیہ کی اس نمائش میں ہے اسمیں اور ہندوستان کے سکیشن میں بڑا فرق یہ ہے کہ ان نوآبادیوں کی اگزبیٹس میں کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جس کو وہ ایسی خوبی اور مقدار میں اب سے پچاس برس قبل بنا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے سکیشن میں کوئی ایسی اگزبیٹ نہیں معلوم ہوتی جس کو ہندوستانی دماغ نے حال میں سیکھا ہو اور وہ ۔

سو برس قبل نہ بنا سکتا ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم تو بہت سی صنعتیں بھول گئے یا ہم اُن کے بھول جانے پر مجبور کئے گئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جو ململ ڈھاکہ میں بنتی تھی آج وہ کہاں ہے؟

وہ فولاد کہاں ہے جو ہندوستان کے نام سے لندن کے بازار میں بکا کرتا تھا وہ چھینٹ کہاں ہے جس کا ذکر کپتان ہملٹن نے کیا ہے۔ وہ زربفت کہاں ہے جس کا خلعت کمپنی کو گورنر سورت نے اورنگ زیب کا فرمانِ شاہی پڑھتے وقت حسب رواج ملک عطا کیا تھا اور جس کا ذکر دوسرے موقع پر کرونگا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا کسی قوم سے جو فوائد پہنچتے ہیں اُن کو نظر انداز کرنا بڑا اخلاقی جرم ہے لہذا ہم آخری باب میں اُن فوائد کا اعتراف کریں گے جو موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو پہونچے ہیں لیکن اس موقع پر ہم کو عہد اورنگزیب کی صنعت و حرفت کا تبلانا منظور ہے اور اس سلسلہ میں مقابلہ کرنا ضروری تھا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں آج ملیں چل رہی ہیں موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ جابجا ہوائی جہاز بھی اُڑتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ سب عہد اورنگ زیب میں کہاں تھا۔ کاش یہ چیزیں ہمارے دماغ کی ترقی کا ثبوت ہوتیں ہم تو ایسی ذری سی چیزوں کے آج محتاج ہیں جیسے دیا سلائی، بوٹ کا پیش ہماری اصلی حالت اب یہ ہے کہ مختلف اقسام کے فنون و صنعت و حرفت سیکھنے کے لئے دوسری قوموں کا منہ تک رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ فرانس جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ جرمنی جاؤ۔ وہاں کے لوگ سکھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ کوئی کہتا ہے کہ

شاید جاپان کو ایشیائی ہمدردی ہو، کوئی کہتا ہے کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔ صنعت وحرفت تم کو کوئی نہیں سکھائیگا تم خود اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرو اور چرخہ کی الف۔ بے سے پھر شروع کرو۔ انگلستان کے ہم مشکور ہیں کہ چند زبانوں کے سکھانے کے واسطے اُسنے اپنی بڑی بڑی یونیورسٹیز کے دروازے بھی ہمارے بچوں کی ایک محدود تعداد کے لئے کھولدئیے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہمارے ملک کے طالب علموں کو اسکی عام شکایت ہے کہ انگلستان اُنکو اس صنعت وحرفت کے سکھانے میں پس وپیش کر رہا ہے جس سے ملک کی وہ دولت وتمول عود کرے جو عہد اورنگ زیب میں پائی جاتی تھی جب کہ صرف ایک ہندوستانی تاجر کا سرمایۂ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمائۂ تجارت کے برابر تھا جیسا کہ کپتان ہملٹن صاحب کے سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے اور جس کا ذکر باب چہارم میں کیا جاچکا ہے۔

باب ہفتم

مہمان نوازی

کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں مہمان نوازی کا ایشیائی شعار بہت کچھ موجود تھا۔ جہاں جہاں انہوں نے سفر کیا ہندوستانیوں کی مہمان نوازی نے انکے دل پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ مثلاً صوبۂ بنگال میں کسی رئیس کی سرحد سے جب انکی پالکی گذری اسوقت وہ رئیس تو شکار کو گئے ہوئے تھے مگر مقام شکار ہی سے دعوت کا رقعہ بھیجدیا۔ چنانچہ کپتان صاحب لکھتے ہیں:-

"جب میں وہاں پہنچا وہ رئیس صاحب شکار کو گئے ہوئے تھے۔ مجھکو سلام کہلا بھیجا اور یہ پیغام بھیجا کہ وہ مجھسے ملاقات کے متمنی ہیں۔ میں نے یہ بہانہ کردیا کہ مجھے نقرس کی شکایت ہے۔ میرے اس عذر کو انہوں نے بلا تامل قبول کرلیا۔ اور میرے کہانے کے واسطے چڑیوں کا مرغن سالن بھیجا۔ اور دوسرے روز شہر کے اکثر معززین مجھ سے ملنے آئے اور یہ خواہش کی کہ جب تک وہاں کے رئیس شکار سے واپس آئیں میں وہاں قیام کروں۔ لیکن مجھے ضروری کام تھا اسلئے مناسب الفاظ میں انکا شکریہ ادا کرکے میں وہاں سے رخصت ہوا"

(جلد اول صفحہ ۳۸۷)

مغربی تمدن کے لحاظ سے بغیر اس کے کہ کوئی شناسا تعریف یعنے انٹروڈکشن کرے

بات کرنا تک معیوب ہے۔ تواضع و مدارات تو درکنار۔ ایک دوسرے مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کنا نور کی سرحد میں داخل ہوئے تو صرف بہ خیال مہمان نوازی وہاں کے رئیس کی بیوی نے جو شاہزادی تھی اپنے ہاتھ سے پان اور شربت دیا۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ایک دوسرے رئیس کو جب کپتان صاحب نے کچھ کپڑا، قالین، اور دو تفنگچے بطور سوغات بھیجے تو وہ اسقدر خوش ہوا کہ اسنے فوراً اپنی کلائی سے ایک زیور جو جواہرات سے مرصع تھا اتار کر کپتان صاحب کو پہنا دیا اور یہ اجازت دی کہ انکی ریاست کے حدود میں کپتان صاحب ہر جگہ بے تکلف سفر کر سکتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۳)

انصاف و امن و امان کے باب میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ جب کپتان صاحب ایک قافلہ کے ساتھ سورت کے قریب پہنچے تو کسطرح لوگوں نے انکی خاطر تواضع کی اور جب وہ گورنر سورت سے ملنے گئے تو کس کشادہ پیشانی سے اُسنے اِنکا استقبال کیا اور انکی دعوت کے لئے ایک گائے پانچ بھیڑیں، پانچ بکریاں، بیس مرغیاں، پچاس کبوتر اور بہت سی مٹھائی اور پھل بھیجے۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۲۰ و ۱۹۰)

کپتان صاحب پھر لکھتے ہیں کہ اہل ہند انگریزوں کی فیکٹری کے افسروں کی بہت عزت کرتے ہیں اور بسا اوقات جب کہیں یہ انگریز شکار کھیلنے جاتے ہیں تو وہاں کے معزز ہندوستانی اپنے ملازمین و اسلحہ اور باجے گاجے کے ساتھ انکے ہمراہ جاتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۳)

یہ مہمان نوازی ایشیائی خلقت میں داخل ہے اور غالباً قدیم زمانہ میں خطۂ عرب دوسرے تمام ایشیائی ممالک سے بھی سبقت لیگیا تھا۔

اَکْرِمُوا ضَیْفَکُمْ لَوْ کَانَ کَافِرًا اَوْ اَجْنَبِیًّا

(اپنے مہمان کا اکرام کرو چاہے وہ کافر ہو یا اجنبی کوئی ہو)

عربوں کا دستور العمل رہا ہے۔ مجھے ایک واقعہ ساحل عرب کا بہت پسند معلوم ہوا جسکا ذکر کپتان صاحب نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ساحل عرب کے کسی مقام پر جہاز میں پانی آنے لگا۔ مجبوراً کپتان صاحب کو لنگر ڈالنا پڑا دیکھا کہ ریگستان میں کچھ جنگلی عرب خیمے ڈالے پڑے ہوئے ہیں گویا وہ اس جہاز کے منتظر تھے۔ یہ عرب مدد کیواسطے فوراً پہونچگئے انہوں نے پہلے یہ طے کرنا چاہا کہ انکو کیا اجرت ملیگی۔ کام یہ تہا کہ جہاز سے کل مال نکالکر ساحل پر جمع کردیں تاکہ جہاز ہلکا ہوجائے اور جہاز کی مرمت کے بعد اسباب پہر لادہ دیں۔ اور اس اثناء میں مال کی پوری حفاظت بھی کریں۔ کپتان صاحب اول تو ڈرے کہ یہ لوگ جہاز کا مال کہیں لوٹ نہ لیں مگر صاحب بہادر لنگر ڈالنے پر مجبور تھے ورنہ جہاز ہی ڈوبا جارہا تھا۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ کل مال دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ اجرت میں دیا جائے جب یہ طے ہوگیا تو عربوں نے کہا کہ مزدوری کی حد تک تو معاملہ ختم ہوگیا مگر اب آئندہ سے تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ کپتان صاحب کو ان جنگلی عربوں کی مہمان نوازی پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایشیائی مہمان نوازی کی روایات ہیں۔ کپتان صاحب کو اسپر بھی حیرت ہوئی کہ وہ اس ریگستان میں پہلے سے خیمے ڈالے کیوں پڑے تھے۔ ان سے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ

اِن عربوں کے پہرے پیشتر سے اسکی اطلاع دیدی تھی کہ فلاں مقام پر ایک جہاز کے مسافر مصیبت میں گرفتار ہونگے تم اُنکی مدد کرنا اور بدمعاملگی نہ کرنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے انگریزوں کا اعتقاد جادو پر تھا۔ کپتان صاحب نے اپنے سفرنامہ میں اِن عربوں کی پیش بندی جادو پر محمول کی ہے خاص ہندوستان کے متعلق جو حالات کپتان ہملٹن صاحب نے عہد اورنگ زیب کے لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت اہلِ ہند بھی مہمان نوازی و مسافر نوازی میں اپنے کسی پڑوسی ایشیائی ملک سے پیچھے نہ تھے یورپ کا موجودہ تمدن جہاں کچھ اچھی باتیں ہم کو سکھا رہا ہے وہاں اسکے ساتھ ساتھ ہمارے قدیم تمدن کی بعض اچھی باتیں ہم کو بھلا بھی رہا ہے منجملہ ان چیزوں کے جو اہل ہند بھولتے جارہے ہیں مہمان نوازی کی عادات ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ یورپ میں مہمان نوازی نہیں ہے لیکن ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں فرق ہے۔ یورپ میں کنبے اور خاندان کی نسبت تصور۔ افراد خاندان کے باہمی فرائض اور ذمہ داریوں کا تخیل ذاتی آسائش و عیش و عشرت کو حتی الامکان ترجیح دینا۔ روزانہ کی ضروریات۔ طرز معاشرت۔ مکان میں کمروں کی تقسیم۔ ہوٹلوں میں رہنے کی عادت۔ زمین کی قلت۔ آبادی کی کثرت۔ مادی ترقی میں بے حد انہماک۔ روحانیت کی جانب بے توجہی۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جنکے اعتبار سے ایشیا و یورپ کے طرز معاشرت و تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے گویا ایشیا اور یورپ ایک دوسرے سے بالکل ہی علیحدہ دو عالم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں جو فرق تھا اور ہے وہ اسی قسم کی مغائرت و فرق کیوجہ سے تھا جنکی طرف

مینے اشارہ کیا مگر جوں جوں ان باتوں میں فرق کم ہوتا جائیگا اسی مناسبت سے دونوں ملکوں کی عادتوں میں مشابہت ہوتی جائیگی اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اہل یورپ میں انسانی ہمدردی کم ہے یا اُن میں نیکی کرنے کا مادہ کم ہے خلق اللہ کو آرام پہنچانے اور انکی تکالیف کو کم کرنے کے لیئے یورپ میں جو انسٹی ٹیوشنس شفاخانوں اور دیگر امدادی جماعتوں کی صورت میں آج بکثرت موجود ہیں وہ اسکی دلیل ہیں کہ دنیا میں اسوقت اہل یورپ بنی نوع انسان کو مدد دینے میں بڑا حصہ لے رہے ہیں اہل یورپ کی تحقیر کرنا ہم ایک اخلاقی جرم سمجھتے ہیں پھر بھی مہمان نوازی کے متعلق ہمارے اور اہل یورپ کے تمدن میں ہمیشہ فرق رہا ہے مثلاً لندن کی حالت یہ ہے کہ اگر کسی کے مکان میں ایک کمرہ بھی خالی ہوگیا تو اسکو دوبھر ہو جاتا ہے فوراً "پے انگ گسٹ" یعنے خرچہ ادا کرنیوالے مہمان کی گنجایش کے عنوان سے روزنامہ اخبار میں اشتہار دیدیا جاتا ہے۔ وہاں ہزاروں آدمی اس قسم کے مہمانوں کی امداد پر زندگی بسر کررہے ہیں ایسی صورت میں اگر باپ کے ہاں اسکا کماؤ لڑکا بھی اچانک آجائے تو گھر میں جگہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے اور اسکو کسی دوسرے شخص کا "پے انگ گیسٹ" (خرچہ ادا کرنے والا مہمان) بنایا جاتا ہے اس سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ وہاں باپ بیٹے میں محبت نہیں ہوتی محبت بہت ہوتی ہے مگر انکا تمدن، انکی روزانہ ضرورتیں اور انکی زندگی کی کشمکش اس طرز معاشرت کے لئے انکو مجبور کرتی ہے۔ ایشیا کا تمدن ہمیشہ اسکے خلاف رہا ہے یہاں مہمان نوازی کو ایک قسم کے مذہبی فرض کی وقعت دیدیگئی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں دو ایک قصے مشہور ہیں جنکو لوگ کبھی کبھی بڑے تمسخر سے بیان کرتے ہیں ایک ہندوستانی

جج ہائیکورٹ تھے جنکی پوری تعلیم ولایت میں ہوئی تھی انکے باپ نے اطلاع دی کہ وہ آرہے ہیں۔ جج صاحب نے فوراً تار دیا کہ مکان میں گنجایش نہیں ہے ذرا تامل کیجئے۔ جب انتظام ہوجائے تشریف لائیے گا۔ یا ایک ہندوستانی بیرسٹر جنا ولایت سے تازہ وارد ہوئے۔ باپ اسٹیشن پر لینے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیرسٹر جنا ہوٹل کے قیام میں زیادہ سہولت سمجھکر اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل تشریف لے گئے اور اسباب وغیرہ وہاں رکھکر پھر ماں سے ملنے گھر گئے۔ ممکن ہے کہ ان واقعات میں کچھ مبالغہ ہو اور لوگوں نے حاشیہ چڑھایا ہو مگر ان دونوں مثالوں سے میرا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ تمدن بدلنے سے کسی ملک کے باشندوں کی جبلی عادات واخلاق میں عظیم الشان فرق ہوجانا ممکن ہے کیا خوب ہوتا اگر ہم اپنے قدیم تمدن کی اچھی باتیں ہاتھ سے نہ جانے دیتے قوموں کی عادتیں سنوارنے میں بہت دیر لگتی ہے بگڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔

بابِ ہشتم

یوروپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ

کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ اس سوال کا جواب مسٹر جے آر اے صاحب نے اثبات میں دیا ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں جہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے قول و فعل پر انہوں نے استدلال کیا ہے اسکی نسبت ہم چند واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ انسانوں کے صدق کذب پر فتویٰ دینے کے لئے ان کی نیت کا معلوم کرنا ایک اہم امر ہوا کرتا ہے اسی نیت کی بنیاد پر بعض وقت ایک ظاہرہ قاتل بے گناہ ٹھہرایا جاتا ہے اور ظاہرہ بیگناہ شخص قتل کا مجرم قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو مراسلت ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے آقا ڈائرکٹرس میں ہوا کرتی تھی اس سے گماشتوں کی کیا نیت تھی کیا غرض اور کیا پالیسی مضمر تھی تو سارا عقدہ کھل جائیگا اور راز فاش ہو جائے گا۔ سر دست تو جب کوئی ہندوستانی رومیش چندر دت کی وہ کتاب پڑھتا ہے جسمیں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی مراسلت سے استدلال کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی صنعت کو کس کس طریقے سے کاریگروں کو ایذا دے دیکر تباہ کیا گیا تھا تو اسکو حیرت ہوتی ہے لیکن اگر آج وہ تمام رازکی خط و کتابت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں اور ان کے

آقا و ڈائرکٹروں کے درمیان ہوا کرتی تھی پیش کر دی جائے تو قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل وطن دنگ ہو جائیں گے ہم کو اس راز کی کچھ جھلک کپتان ہملٹن کے سفر نامے سے بھی ملتی ہے یہ منجملہ انہیں واقعات کے ایک واقعہ ہے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کے صدق و کذب کا پتہ چلتا ہے اور اُس سے انکی نیت معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اقوال و افعال کیا تھے اور نیت کیا تھی۔ جس کے بعد وہ تمام شہادت مشتبہ ہو جاتی ہے جو عہد مغلیہ کے نظم و نسق کے خلاف وہ گڑھا کرتے تھے۔ کپتان صاحب ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اُس خط کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پڑھا ہے جو ولایت سے ڈائرکٹروں نے بطور ہدایت نامہ یا دستور العمل اپنے ملازمین و عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھیجا تھا۔ اُس خط میں حکومت مغلیہ سے چھیڑ چھاڑ قائم کرنے کی ایک تدبیر بتلائی تھی وہ یہ تھی کہ تم ہندی تجار و متمول اشخاص سے روپیہ قرض لو اور جب رقم کثیر ہو جائے تو کوئی ایسی لڑائی جھگڑے کی بات پیش کرو جس کی وجہ سے قرضہ کا مسئلہ تو پیچھے پڑ جائے اور وہ نزاع سامنے آ جائے۔ اس طریقہ سے قرضہ بھی ہضم ہو جائے گا اور حکومت کے خلاف لڑائی کا بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک جانب تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگوں نے شاہی فوج کے غلہ و رسد سے بھرے ہوئے جہاز بمبئی کے قریب سمندر میں پکڑ لئے اور دوسری جانب اُسی کمپنی کے گورنر و ایجنٹ مسٹر چائلڈ نے ایک لمبی چوڑی شکایتی درخواست حکومت مغلیہ کے گورنر مقیم سورت کے پاس بھیجی جس میں (۳۵) شکایتیں درج تھیں اُس پوری درخواست کی نقل کپتان صاحب نے

اپنے سفرنامے میں کردی ہے۔ اگر میں بھی اسکی پوری نقل کرنے بیٹھوں تو کئی صفحے اس کی نذر ہوجائینگے اور ناظرین کا وقت ضائع ہوگا تاہم اسکا اندازہ کرنے کے لئے کہ باوجود تصنع اور بناوٹ کی سخت کوشش کے کس نوعیت کی بیجا شکایتیں کی گئیں اس درخواست کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں یہی وہ سنگین ترین شکایتیں تھیں جو عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کرسکی معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے پر بھی اس سے زیادہ مواد و شہادت دستیاب نہ ہوسکی۔ ان شکایات کی صداقت کا تصفیہ کرتے وقت ناظرین اسکو کبھی نہ بھولیں کہ یہ محض سیاسی درخواست تھی اور اس سے اصل مقصود لڑائی کا بہانہ ڈھونڈھنا تھا جس کو دوسرے الفاظ میں کہتے ہیں خاک اڑانا کہنا چاہیئے۔ اس درخواست کے فقرات ا و ۲ و ۳ میں ایک ہندوستانی سوداگر مولا عبدالغفار کی یہ شکایت ہے کہ اس نے کمپنی کے نسبت غلط افواہیں اڑائیں جس سے کمپنی کا نام بدنام ہوگیا اور اعتبار بھی مقابلہ نہ ہونے کے جاتا رہا۔ یہ وہی عبدالغفار تاجر ہے جس کا ذکر میں باب (تجارت) میں کرچکا ہوں اور جس کے متعلق کپتان ہملٹن کی یہ رائے تھی کہ صرف اس ایک متنفس ہندوستانی کا سرمایہ تجارتی کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کے برابر سمجھا جاتا لیا یہ عبدالغفار تجارت میں کمپنی کا مقابلہ کررہا تھا۔

چوتھی دفعہ میں دو انگریز ایک مسٹر پیٹٹ (Pitit) اور دوسرے مسٹر باؤچر (Boucher) کی شکایت عجیب و غریب الفاظ میں کیگئی ہے اس امر کے لکھنے کے بعد کہ وہ کمپنی کے روپیہ کا حساب کتاب نہیں سمجھاتے اور اب شاہی حکومت کی پناہ میں بمقام سورت محفوظ بیٹھے ہوئے ہیں جو مطالبہ کمپنی کی جانب سے

اِن انگریزوں کی بابتہ کیا گیا تھا اُسکا ترجمہ یہ ہے :-

"مسٹر پٹیٹ تو مر گیا اور جہنم واصل ہوا لیکن مسٹر باؤچر سورت میں بیٹھے ہوئے ہیں"

"میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اور اسکی بیوی بچے اور اُسکے تمام متعلقین انگریز معہ"

"اُنکے مال واسباب کے میرے حوالہ کئے جائیں تاکہ وہ سورت سے فرار نہ ہو سکے"

(یہاں تو میں اسی اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں لیکن میں دوسرے باب میں دکھلاؤنگا کہ عہدہ داران کمپنی لوگوں کی بیوی بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا کرتے تھے)

دفعات ۵ و ۶ و ۷ میں یہ شکایت تھی کہ حال میں بعض اشیاء پر خفیف محصول بڑھا دیا گیا ہے وہ واپس دلایا جائے (اول تو ٹیکس ہی کیا ہوتا تھا جب کپتان صاحبان ریسہ پہنچے ہیں تو کل ٹیکس جو اُن سے وصول کیا گیا ۳ شلنگ تھا جسمیں ملازمین اور کہاروں کی مزدوری بھی شامل تھی (ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۳۳۸) میں پوچھتا ہوں کہ آج وہ کون دعویدار تمدن ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی خود مختار سلطنت کو محصول میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے)

دفعہ (۸) قابل غور ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بہ پابندی فرامین شاہی اس ملک کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ جب کبھی کمپنی کا کچھ مال سرقہ جاتا تھا تو اسکی تلافی خزانہ شاہی سے کر دی جاتی تھی مگر سورت کے گورنر نے اب یہ طریقہ بند کر دیا ہے۔

(اس کے متعلق میرا یہ سوال ہے کہ مجھے بتلایا جائے کہ دنیا بھر میں آج وہ کونسی حکومت ہے جو مال واسباب کی حفاظت کی ذمہ داری اس حد تک قبول کرتی ہے)

دفعہ (۹) میں کچھ ہندوستانی قرضداروں کی نادہندی کی شکایت ہے
دفعہ (۱۰) میں یہ شکایت ہے کہ شاہی دارالضرب میں روپیہ جلد جلد مسکوک نہیں ہوتا۔
دفعات (۱۱ و ۱۲) ذرا زیادہ قابل غور ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کمپنی کی حسابی کتابوں پر ہمیشہ اعتبار کیا جاتا تھا اور آخر سال پر اسکے ہی کھاتے دیکھکر محصول لیا جاتا تھا لیکن اب یہ قاعدہ جاری ہوا ہے کہ جونہی مال سرزمین ہندوستان پر اُتارا جاتا ہے محصول وصول کر لیا جاتا ہے (میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا تھا تو وہ کیا بیجا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور تمام یورپ یہی کر رہا ہے۔)
دفعہ (۱۳) میں یہ شکایت ہے کہ گورنر نے سرکاری قلعہ کی دیوار سیدھی کرنے کے لئے کمپنی کی کچھ اراضی حاصل کر لی ہے جسکا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا۔
دفعات ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ میں محکمہ کروڑگیری یعنے محکمہ وصول محصول کی جزوی شکایتیں ہیں۔
دفعہ ۱۷ میں یہ شکایت ہے کہ قرضداروں سے روپیہ وصول نہیں ہوتا اور انکی نسبت دادرسی نہیں ہوتی اور استدعا تھی کہ گورنر اسکی تلافی خزانہ شاہی سے کر دے۔
(میں پوچھتا ہوں کہ اگر آج کوئی تاجر کسی حکومت سے ایسا مطالبہ کرے تو اُس کو کیا جواب ملیگا)
دفعہ (۱۸) میں یہ شکایت ہے کہ اُن کے کارندوں کو گورنر کے روبرو حاضری کا موقع اسوقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نوکروں کو بخشش نہیں دیجاتی۔

دفعہ (۱۹) بدیں مضمون ہے کہ تجارتی گھوڑے جو ایران اور بصرہ سے آتے ہیں انکی گردنوں پر مُہر کردیجاتی ہے اور بغیر محصول ادا کئے ہوئے نہ وہ فروخت کئے جاسکتے ہیں نہ اپنر سواری کی اجازت ہوتی ہے دفعہ ۲۰ میں عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے۔

دفعات ۲۱ و ۲۲ میں محکمۂ کروڑگیری کی تعویق و دیگر جزوی شکایتیں ہیں دفعہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ جب کمپنی اپنے انگریز ملازمین کو ہندوستان کے دور و دراز شہروں میں بھیجتی ہے تو وہ شاہی گورنر کی حفاظت میں اسطرح آجاتے ہیں کہ پھر اُن سے مطالبہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے اور اس موقعہ پر بھی وہی مسٹر پیٹیٹ Mr. Petet اور مسٹر باؤچر Mr. Boucheer کی مثال پیش کیگئی ہے جن کا ذکر دفعہ ۱۴ میں آچکا ہے۔

دفعہ ۲۴ میں ایک قطعہ اراضی کی بابتہ شکایت اور نیز جدید اراضی کے وصول کی درخواست ہے۔

دفعہ ۲۵ کا مضمون یہ ہے کہ حسب دستور سابق محصول وصول کرتے وقت اُن کا مال کھولکر نہ دیکھا جائے اور یہ کہ اُن کے اعتبار پر عمل ہو (مگر یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔ آج بھی یورپ کے ممالک میں اسباب کھولکر دیکھا جاتا ہے)

دفعہ ۲۶ میں بھی عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے

دفعہ ۲۷ میں مکرر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ ۲۸ میں بہ بارہ اُسی مسٹر باؤچر Mr. Boucheer کا قضیہ پیش کیا گیا ہے جس کا ذکر دفعات ۱۲ و ۲۳ میں کیا جاچکا ہے دفعہ (۲۹) میں بہ بارہ

پھر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ (۴۰) میں کسی ناظم کی شکایت ہے۔

دفعہ (۴۱) میں لکھا ہے کہ ان کا لوہے کا ایک لنگر دریا میں گم ہو گیا تھا وہ مرزا معظم کے لڑکے کو ملا ہے وہ واپس دلایا جائے اور اس کے ڈھونڈنے میں جو خرچ ہوا ہے وہ بھی دلایا جائے (ذرا اس جزوی شکایت کی نوعیت پر غور کیا جائے)

دفعہ (۴۲) کی شکایت کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کا جہاز ساحل ہندوستان پر پہنچتا ہے تو کروڑگیری پر ان کے آدمیوں کی روک ٹوک بہت کی جاتی ہے۔ اس سے تعویق ہوتی ہے دفعہ (۴۳) بھی قابل غور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کمپنی کے لوگوں نے کچھ شاہی جہاز پکڑ کر ان میں آگ لگا دی تھی اس کی بابت مسٹر چائلڈ بلیک پیشتر از رگ واویلا تحریر فرماتے ہیں کہ انکا کچھ بھی لگاؤ اس فعل سے نہیں ہے پھر اس کے متعلق مسٹر چائلڈ درخواست دہندہ سے بازپرس نہ کی جائے۔ (اس شکایت کو جو کوئی پڑھے گا ہم نہیں جانتے کہ بجز چور کی ڈاڑھی میں تنکا اور کیا کہے گا۔ اب کیپٹن ہملٹن کی تحریر سے معلوم ہوا کہ خود ان حضرات کو بھی اس قسم کے افعال کرنے کی ہدایت ولایت سے ہوئی تھی اور اس شکایتی درخواست کا دینا اور سرکاری غلہ کے جہازوں کو پکڑنا سب اسی ہدایت کے بموجب تھا۔

دفعہ (۴۴) میں ہندوستانی قاتلوں کی تحویل کا مطالبہ ہے۔ اور آخری دفعہ (۴۵) بدیں مضمون ہے کہ شام کو شہر کا دروازہ قبل از وقت بند کر دیا جاتا ہے اور جب وہ شہر کے باہر سے سیر کر کے واپس آتے ہیں تو بغیر بخشش و انعام دیے اندر داخل ہونا دشوار ہوتا ہے۔

بس یہ درخواست کا مضمون ختم ہو گیا قبل اس کے کہ ان شکایتوں کے متعلق کچھ لکھوں ذرا مسٹر چایلڈ صاحب گورنر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کیرکٹر پر نظر ڈالئے جنہوں نے یہ شکایتی درخواست مرتب کر کے شاہنشاہ کے گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی۔ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ جب مسٹر چایلڈ ایک مرتبہ کپتان تھاربرن سے ناراض ہو گئے تو انکی جائداد ضبط کرنے اور ان کو جیل خانہ بھیجنے کی غرض سے مسٹر چایلڈ نے جعلی دستاویزات بنائیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۵)

مسٹر چایلڈ جب ایک مرتبہ مسٹر بوچر (Mr. Boucher) سے ناراض ہو گئے تو مسٹر بوچر کو زہر خورانی کے جو انتظامات مسٹر چایلڈ نے کئے تھے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۶ - ۱۹۷)

مسٹر چایلڈ ایک مرتبہ مسٹر پیٹ سے ناراض ہو گئے اور جب مسٹر پیٹ سمندر کے قزاقوں کے ہاتھ پکڑ لئے گئے تو مسٹر چایلڈ نے قزاقوں سے کہلا بھیجا کہ مسٹر پیٹ بڑا مالدار ہے اس سے خوب وصول کرنا۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۸)

یہ تو مسٹر چایلڈ کا کیرکٹر تھا۔ یہ واقعات زیادہ تفصیل سے باب نہم میں بیان کئے جائینگے۔

جہاں تک شکایتی درخواست کا تعلق ہے۔ اب ناظرین خود سمجھ لیں گے کہ ان شکایتوں کی کیا نوعیت و اصلیت تھی۔ اگر کسی غیر ملک کا تاجر آج بھی کسی گورنر کے روبرو ایسی درخواست پیش کرکے ویسا ہی مطالبہ کرے جو اس درخواست میں کیا گیا ہے۔ تو اس کا حشر کیا ہوگا علی الخصوص جبکہ یہ معلوم

ہو جائے کہ وہ درخواست خواہ مخواہ لڑائی کی چھیڑ چھاڑ کی غرض سے پیش ہوئی ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد اورنگزیب میں اسکا نتیجہ کیا ہوا جب یہ درخواست گورنر سورت کے پاس پہنچی تو شیدی یعقوب کمانڈر افواج شاہی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کو اولاً مہذبانہ طریقہ سے ایک خط لکھا جس میں کمپنی کے طرز عمل پر اعتراض کیا لیکن جب کمپنی کی جانب سے متمردانہ جواب آئے تو صوبہ دار نے بالآخر یہ تحریر کر دیا کہ اگر گرفتار شدہ شاہی جہاز ۱۱ر فروری تک نہ چھوڑ دئے جائینگے تو ۱۴ر فروری کو فلاں وقت شاہی فوج بمبئی میں داخل ہو کر ہر چیز پر قبضہ کر لیگی۔ مجھ کو اس ہندوستانی فوجی افسر کی یہ سپاہیانہ ادا بہت پسند آئی کہ اُس نے دشمن کو پہلے سے اپنی آمد کے وقت تک کی بھی اطلاع دیدی کہ اگر متنبہ ہو کر سنبھل جائے تو بہتر ورنہ مقابلہ کے لئے تیار رہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا اگر مسٹر چائلڈ پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی حمایت کا نشہ سوار تھا۔ اُس زمانہ میں یہ لوگ بغیر فوجی مدد کے سمندر میں سفر نہیں کر سکتے تھے ولایت کے راستے بحری قزاقوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھے علاوہ ازیں وہ یہ عہد نہ تھا کہ کسی قوم کے ہتھیار لیکر اسکو نامرد بنایا جائے ہر شخص مسلح رہا کرتا تھا۔ لہذا کمپنی کے پاس بھی فوج تھی توپیں تھیں خزانہ تھا اور غالباً اسی غرّے پر انکو جنگ چھیڑنے کی جرات ہوئی تھی۔ کپتان ہملٹن لکھتے ہیں کہ جو کچھ شیدی یعقوب شاہی فوج کے کمانڈر نے پیشتر لکھا تھا بالکل اسی کے مطابق اس نے عمل کیا اور جو وقت اُس نے مقرر کیا تھا ٹھیک اُسی وقت مع فوج کے پہنچا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۷) آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور جب

معرکہ میں شیدی کی فوج تلواریں ہاتھ میں لیکر یلغار کرتی ہوئی انگریزی فوج پر جا پڑی۔

"تو کمپنی کا کپتان میدان سے بھاگ نکلا اور بھاگنے والوں میں بھی سب سے آگے تھا۔ پرتگیزوں کے گرجے میں پہونچکر جب ذرا اس کے حواس درست ہوئے تو اُس نے پیچھے مڑکر اپنے آدمیوں کو دیکھا کہ اُنکا کیا حشر ہوا۔"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۲۰)

کپتان صاحب پر یہ سب سرگزشت بیتی تھی وہ خود اسی بھنور میں گرفتار تھے اور سب معاملہ کو بچشم خود دیکھ رہے تھے۔ ازبسکہ انکی حیثیت کمپنی کے ملازم کی نہ تھی وہ ایک آزاد خود مختار تاجر تھے مگر مثل دوسرے انگریزوں کے وہ بھی کمپنی کی حفاظت میں رہتے تھے وہ کمپنی کی اس رذیل حرکت پر بہت مشتعل ہوئے اور اپنے سفرنامہ میں انہوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگر راوی کا بیان راوی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ مگر وہ انگریزی میں ہے اس لئے ابتداء سے جو واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں اُن کا ترجمہ کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ:—

"کمپنی کے پاس یوں تو بہت سے بڑے بڑے جہاز تھے جن کو ملک سے باہر بھیجنے کے لئے وہ مجبور تھی لیکن اُن کو کام میں لانے کے لئے چونکہ کمپنی کے پاس کوئی سرمایہ نہ تہا اس لئے اس نے اپنے جنرل کو اور نیز اپنے ان کارخانوں کے عہدہ داروں کو جو ہندوستان میں تھے حکم دیدیا تہا کہ وہ اپنے جہازات وطن کے جانیکے لئے ہندوستانی تاجروں سے جسقدر رقم قرض حاصل کرسکتے ہوں کمپنی

"کی ذمہ داری پڑے لیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو جہاز وہ اپنے
"وطن کو نہ لے جا سکے انکو کرایہ پر ہندوستان میں چلایا۔ میں نے کمپنی کے گورنر کا
"ایک خط انگلستان میں دیکھا جسمیں یہ لکھا تھا کہ جب وہ مغل شہنشاہ کی رعایا سے
"جسقدر روپیہ حاصل کر سکتے ہوں لے لیں تو فوراً وہ سب جھگڑا اکے یک لخت انکے
"ساتھ لین دین موقوف کر دیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کیونکہ ١٦٨٦ء و ١٦٨٧ء
"میں سورت کے ہندوستانی تاجروں نے سمندر کے راستے سے مغرب میں بہت بڑی
"تجارت مخا۔ ایران اور بصرہ سے قائم کر لی تھی اور مشرق میں بنگال و چین اور
"سیام سے بیوپار کرتے تھے وہ جنرل سب لوگوں کو انکی استدعا پر پروانہ راہداری
"دیدیا کرتا تھا پھر اس کے بعد ١٦٩٨ء کے آخر میں ایک شکایت صوبہ دار سورت
"کے روبرو پیش کی اور انصاف و اطمینان کا طالب ہوا۔ اس شکایت کی ایک
"مطبوعہ کاپی مینے خود دیکھی ہے۔ وہ حسب ذیل (٣٥) فقرات پر مشتمل تھی"

(جلد اول صفحہ ١٩٩)

سفر نامے میں اس جگہ پوری درخواست نقل کر دی گئی ہے جسکا خلاصہ بیان کیا جا چکا ہے۔ انگریزی کیرکٹر کا ایک رخ ہمیشہ ایسا رہا ہے جسکی تعریف و مدح کرنا ہر منصف مزاج کا فرض ہے۔ جب کبھی وہ ڈپلومیسی و سیاسی اغراض سے بلند پروازی کر جاتا ہے تب اسکی آزادانہ رائے میں ایک ایسی دلکش و دلفریب خوبی پیدا ہو جاتی ہے جس سے دوسری قوم والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اس موقع پر کپتان ہملٹن نے بھی اسی انگریزی کیرکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ آخر تمام بنی نوع انسان ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں اور نیکی و

و بدی کی حرکات سے ہر انسان کا دل یکساں متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان شکایات کی نسبت کپتان ہملٹن نے جو رائے قائم کی تھی وہ انسان کی اصلی خلقی صداقت پسندی کا نمونہ ہے۔ درخواست کی نقل کرنے کے بعد کپتان صاحب لکھتے ہیں

"یہی وہ شکایتیں ہیں جن کی بنیاد پر جنرل چائلڈ نے سلطنت مغلیہ کے ساتھ ایک جنگ کی عمارت قائم کی اور اپنی شکایات بادشاہ تک پہنچانے اور منشائے شاہی معلوم کرنے کے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔ جہاں کہیں بادشاہی رعایا کے جہاز ملے انکو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ جہاز خود انہیں کے عطا کردہ پروانہ جات راہداری پاس رکھتے تھے شکایت مذکورہ کا فقرہ (۲۴) ایسا ہے کہ گو وہ ایک عیسائی کے قلم سے نکلا ہے لیکن ہر مسلمان اور بت پرست بھی اسکو نفرت کی نظر سے دیکھے گا۔ فقرات نمبر ۱۷ و ۲۳ و ۲۸ خلاف انصاف ہیں اور فقرات نمبر (۳۰ و ۳۱) اُس شکایت اور جنگ کے لئے بہت ہی کمزور وجوہ ہیں جسکی وجہ سے مسٹر چائلڈ کے آقا اور مالکوں کے زائد از چار لاکھ پونڈ اختتام جنگ سے قبل ہی خرچ ہو گئے علاوہ ازیں بادشاہ اور اسکی رعایا کے نزدیک ان لوگوں کا اعتبار اُٹھ جاتا رہا جو آجتک پوری طرح جیسا کہ چاہیے قائم نہیں ہوا ہے۔ وہ کون قاعدہ اور پالیسی تھی جسکے بموجب یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ باوجود اسکے کہ بادشاہ مغلیہ کے ایک حصہ حکومت میں تو مسٹر چائلڈ یا سر جوزیا (Sir Josiah Child) بادشاہی رعایا کو قتل و غارت کریں اور بادشاہ موصوف اپنے دوسرے حصہ حکومت میں کمپنی کو امن و امان کیساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیں۔ نہیں معلوم یہ لوگ کسطرح اسکی امید کر سکتے تھے کہ ایسے موقعہ پر بادشاہ غیر جانبداری کی صورت اختیار کر لیتے

"اس سوال کا جواب تو وہ مدبرین گے جن کو پالیٹکس میں دخل ہے۔ میں تو صرف اصلی واقعات بیان کرتا چلا جا رہا ہوں"

(جلد اول صفحہ ۲۱۳)

معلوم ہوتا ہے کہ سر جوزیا (Sir Josiah) وہی حضرت ہیں جو بنگال میں ایسے افعال کے مرتکب ہو چکے تھے کہ جن کی وجہ سے مسٹر چائلڈ کو بھی اپنی درخواست کی دفعہ ۲۳ میں پیش بندی کرنی پڑی۔ بہرحال جب خود ایک بے غرض اور بے لوث انگریز نے اس طرح اپنی رائے ظاہر کر دی تو اس میں اور کچھ اضافہ کرنا غیر ضروری ہے البتہ اس سے چند نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں اول یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ سلطنت مغلیہ کی طرف سے پہلے بہت رعایت کیجاتی تھی مگر کمپنی مذکور بجائے اس کے کہ وہ سلطنت موصوفہ کی مشکور ہوتی اور خوش کرداری سے اپنے متعلق مزید مراعات شاہی کا مستحق بناتی اس نے کچھ ایسے اعمال کئے کہ اس کے اعتبار میں فرق آگیا۔ دوسرے یہ کہ عہد اورنگ زیب میں محصول کے متعلق زیادہ جانچ پڑتال شروع ہوئی جو کمپنی کو برا معلوم ہوا عجب نہیں کہ اسکی ضرورت بھی خود کمپنی ہی کے اعمال کی وجہ سے سلطنت کو ہوئی ہو۔ تیسرے یہ کہ اس زمانہ کی گورنمنٹ کو غیر ممالک کے تجار کی جان و مال کی حفاظت کا اسقدر خیال تھا کہ اگر انکا کوئی مال سرقہ جاتا تو خزانہ شاہی سے اسکی تلافی کیجاتی تھی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے غالباً جانچ پڑتال میں جد و جہد کی کامل ضرورت ہوتی تھی اور یہ صحیح نہیں ہے کہ محض وصول محصول کے لئے ایسا کیا جاتا تھا۔ محصول وصول کرنے میں جو جانچ پڑتال

کی سختی کی جاتی تھی اس کی نسبت ایک امر کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ہوا انکی نگاہ سے وہ سماں گزرا ہوگا جب کہ ایک فرانسیسی یا انگریز یا جرمن مسافر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر بعض وقت صرف اس خیال سے کہ محصولی مال چھپا رکھا ہوا اس طرح ٹٹولتا ہے کہ گویا وہ مسافر چور ہے۔ غالباً احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے کیونکہ مجھسے خود ایک یوروپین نے کہا کہ ایک مرتبہ انکی لیڈی صاحبہ بہت سے سگریٹ اپنے انڈرویر یعنے اندر پہننے کے کپڑوں میں چھپا کر فرانس لے گئی تھیں گزشتہ سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ پیرس میں ایک جنٹلمین صاحب اپنا اسباب گورنس کے سپرد کرکے چلدئے اور جب محصول لینے والا آیا اور دریافت کیا تو گورنس صاحبہ محصولی مال کے ہونے سے صاف انکار کر گئیں مگر جب ایک بکس بطور نمونے کے کھولا گیا تو اس میں سے محصولی مال برآمد ہوا پھر تو ہر بکس کھولا گیا جس سے سارا اسٹیشن ایک اچھا خاصہ مینا بازار بن گیا خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جو موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات سے متعلق تھا۔ یہاں اصل عہد اورنگ زیب کا ذکر ہے لیکن موجودہ واقعات کے تعلق سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عہد موصوفہ میں محصولی اسباب کی جانچ پڑتال میں کدو کاوش یا شرح محصول کی رد و بدل میں حکومت نے کیا جرم کیا تھا وہ لوگ جن کو بادشاہ نے اپنے ملک میں تجارت کی اجازت دی تھی۔ زمینیں عطا کی تھیں۔ جو بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں باطمینان صرف بسر ہی نہیں کرتے تھے بلکہ تجارت کی بدولت وہ ہندوستان کی دولت سے بھی مستفید ہورہے تھے

انھیں لوگوں نے ایسی ناشکری اور کمینہ پن کی حرکت کی جس سے خود اُن ہی کی قوم کا ایک فرد متنفر تھا اسوقت اورنگ زیب کی قوت مسلمہ تھی اُس کو انگریزی تجار کا خوف نہ تھا اس کے قلم کی ایک گردش ان کی تجارت کا خاتمہ کر سکتی تھی عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حالت ایک شیرخوار بچہ کی تھی چنانچہ وہی لوگ جنھوں نے یہ شکایتی درخواست اس زور و شور سے بھیجی تھی اور جنگ کی تھی اُن کو اپنی ناعاقبت اندیشی کے خمیازہ میں اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونے اور معافی حاصل کرنیکی تدبیر کرنی پڑی۔ ایک وفد تیار کیا گیا جس میں کپتان ہملٹن بھی شریک تھے اور جس ذلت آمیز طریقے سے یہ وفد شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب کے حضور میں پیش کیا گیا اس سے کپتان صاحب کو بہت ہی تکلیف ہوئی کیونکہ وہ اُنکی قومی خودداری کے بہت ہی خلاف تھا۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں :-

"دربار میں انکی رسائی تو ہوگئی۔ لیکن اورنگ زیب کے حضور میں وہ اس ذلت کے ساتھ پیش کئے گئے جو کسی ملک کے سفیروں کے لیے زیبا نہ تھی۔ سامنے انکے دونوں ہاتھ ایک پٹکے سے باندھ دئیے گئے تھے اور اس حالت سے" "بادشاہ کے روبرو خمیدہ پشت زمیں بوس ہئیت میں پیش کئے گئے"

(جلد اول صفحہ ۲۲۴)

یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی کیفیت تھی اور اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بالآخر اورنگ زیب نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ اورنگ زیب کا اصلی کیرکٹر جانچنے کا یہ بہت نازک وقت تھا۔ یہی وہ مواقع ہوا کرتے ہیں جن پر

ایک بادشاہ کا اصلی کیرکٹر معلوم ہوتا ہے جب مرور زمانہ سے انسانی جذبات کا بادل چھٹ جاتا ہے اور مورخ کے سامنے صرف سچائی اور اصلیت کا صاف مطلع باقی رہ جاتا ہے تب ایسے ہی وقت کے افعال پیش نظر ہوتے ہیں۔ آج سوا دوسو برس کے بعد ہم اس امر کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟

میری رائے میں اورنگ زیب نے جو طرز عمل ایسے موقع پر اختیار کیا اسی سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کیا اس بادشاہ کا یہ مقصود تھا کہ اہل یورپ ہندوستان میں تجارت نہ کرنے پائیں؟

درخت کی ایک پتی کی حرکت سے نہیں بلکہ بعض وقت ایک تنکے کی حرکت سے سینکڑوں میل کی ہوا کا رخ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح بعض وقت انسان کے ایک فعل سے ہی اسکے تمام کیرکٹر کا پتہ چل جایا کرتا ہے۔ اس موقع پر مغلوب غالب کے پاس جاتا ہے۔ عاجز قادر کے روبرو حاضر ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ غالب و قادر کیا کرتا ہے۔ کپتان ہملٹن لکھتے ہیں کہ جب یہ وفد اورنگ زیب کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ پہلے تو بہت غیظ و غضب میں معلوم ہوتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ غصہ اتر گیا تب بادشاہ نے دریافت کیا کہ تمہاری کیا درخواست ہے وفد نے پہلے قصور کی معافی مانگی اور بعدہ دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت چاہی اوسوقت اورنگ زیب نے اپنے اصلی کیرکٹر کا اظہار کیا اور الطاف شاہی سے یہ دونوں درخواستیں منظور کر لیں۔ وفد کو حکم ہوا کہ وہ بمبئی واپس جا بعدہ فرمان مبارک

بھیجا جائیگا چنانچہ کچھ روز بعد فرمان شاہی اُن تمام لوازمات کے ساتھ
شرف صدور لایا جو ایسے موقعوں پر بطور اعزاز و اکرام مبذول فرمائے
جاتے ہیں۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سورت میں ایک بڑا دربار
منعقد کیا گیا۔ اس دربار میں وہ فرمان شاہی پڑھا گیا جس کا ترجمہ کپتان صاحب
نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اور جس کا اب اردو ترجمہ میں پیش کرتا ہوں
لوازمات فرمان شاہی یہ تھے کہ فرمان کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ گھوڑا
و بیش قیمت اطلس یا زربفت کا خلعت بھی جسپر کارچوبی سنہری روپہلی گل
بوٹے کاڑھے گئے تھے عطا ہوا۔ یہی فرمان وہ چارٹر (Charter)
و منشور خسروی تھا۔ جو اورنگ زیب کے پیشگاہ سے کمپنی کو عطا ہوا تھا اور
جسکی سند پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر ہندوستان میں تجارت شروع
کی تھی۔

ترجمہ فرمان شاہی
اورنگ زیب بنام ایسٹ انڈیا کمپنی

"تمہاری عرض داشت بدین مضمون بادولت واقبال کے ملاحظہ میں آئی"
کہ جسقدر فتنہ و فساد پیدا ہوا اسکے قصوروار تم ہو۔ تم نے صوبہ داران سابق
کے خلاف متعدد شکایتیں کی تھیں جن کا ذکر بادولت نے اپنے امرائے دربار سے
سُنا۔ تم کو یہ شکایت تھی کہ صوبہ داروں یا ماتحت عہدہ داروں نے تمہارے ساتھ

"بدسلوکی کی تم کو لازم تھا کہ شورش برپا کرنے سے قبل ان سب باتوں کی اطلاع تم"
"مجھ کو دیتے۔ لیکن اب چونکہ تم اپنی خطا کے معترف اور خواستگار معافی ہو لہذا"
"واقعات گزشتہ کو معاف کرکے صرف تمہاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی"
"بلکہ تمہارے حسب استدعا تم کو ایک فرمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور اسد خاں"
"کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بعد از تمام تفصیلات جنکی اطلاع وہ تم کو دیدیگا فرمان مذکور"
"صوبہ دار سورت کے پاس روانہ کردے۔ جس وقت یہ فرمان نافذ ہو تم اس کی"
"تعظیم و احترام کیساتھ وصول کرو اور اسکی عزت و شرف کا اقبال و اعتراف کرو"
"جو فرمان مذکور صادر کرکے تم کو بخشا گیا ہے۔ جیسے تم پیشتر تجارت کیا کرتے تھے"
"اب بھی اسی طرح حسب معمول تجارت کرنیکی تم کو اجازت دی جاتی ہے۔ جن تاجروں"
"کی تم شکایت کر رہے ہو تم پر واجب ہے کہ ان کے جہازات معہ سامان انکے"
"حوالہ کردو اور آئندہ سے اس قسم کی غلطی کبھی نہ کرنا جس کے تم اس مرتبہ مرتکب ہوئے"
"ہمیشہ مابدولت کی خوشنودی و رضاجوئی کے امیدوار رہو۔ اور اسکو کبھی نظر انداز"
"نہ کرو۔ اگر تم کو میرے صوبہ داروں عہدہ داروں یا میری رعایا سے کسی قسم کی"
"اذیت پہنچے تو اسکی اطلاع دینے میں کبھی فروگزاشت نہ کرو۔ مابدولت نے"
"اسد خاں کو حکم دیدیا ہے کہ وہ اسی کے مطابق تحریر کرے۔ مسمی باؤ جیرا کی"
"پناہ دہی کے متعلق تم نے شکایت کی ہے کہ سابقہ صوبہ داروں نے اسکو اپنی"
"پناہ میں لے لیا ہے اور نامبردہ پر تمہاری کئی رقوم واجب الادا ہیں اور اس لیے"
"تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سپرد کردیا جائے۔ اس بارے میں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنا دعوی"
"(عدالت میں) بروئے قانون ثابت کرو اسوقت جو مقتضائے انصاف ہوگا عمل میں آئیگا

"سنہ ۱۲ جلوس اورنگ زیب"

(جلد اول صفحہ ۲۲۷)

یہ فرمان اورنگ زیب کے کیرکٹر کی کنجی ہے۔ اِس فرمان سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویہ کا مقابلہ اورنگ زیب کے الطاف و کرم سے کیجئے۔ وہ مورخ جسکو اصلی واقعات نہیں معلوم جو چاہے کہے یا لکھے مگر ۱۶۸۷ء میں اس انگریز کے دل پر جو اُس وفد میں شریک تھا اورنگ زیب کے رحم و کرم شاہانہ کا جو اثر ہوا وہ یوں ظاہر کرتا ہے:-

"یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اُس بدسلوکی سے جو اسکی رعایا کے ساتھ کی گئی تھی"
"لاعلم نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ جرائم اور خطاؤں کے پاداش میں کچھ سخت سزا بھی نہیں"
"دینا چاہتا تھا اس لیئے اُسنے ایک رحمدل بادشاہ کی طرح ان لوگوں کو اُن کے قصور"
"سے آگاہ کر دیا اور ان کو دانشمندانہ نصیحت کی کہ آئندہ ایسی غلطی کے مرتکب"
"نہوں۔ شاہانہ طریق سے انکو سمجھا دیا کہ وہ عنایات و عطوفات شاہی کو بنظر"
"شکر و سپاس دیکھیں اور پابندی قانون کو اپنا مسلک قرار دیں۔ غرض کہ اس بادشاہ"
"نے تمام اقوال و افعال میں پوری طرح صحیح تحمل سے کام لیا"

(جلد اول صفحہ ۲۲۹)

آج کلکتہ میں جس مقام پر فورٹ ولیم قلعہ بنا ہے وہ زمین کس نے اور کیوں کو دی تھی؟

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اورنگ زیب

کی رعایا پر قتل و غارتگری کیا کرتے تھے۔ اور ڈاکے مارا کرتے تھے لیکن ایک موقعہ پر اورنگ زیب نے ان خونریزیوں کو معاف کرکے کمپنی کے ایجنٹ وپائنڈ مسٹر جونڈف چناک کو یہ حکم دیا کہ وہ بنگال میں کوئی زمین اپنے قیام گاہ و مال واسباب کی منڈی قائم کرنے کے لئے خود منتخب کرلیں تب اس ایجنٹ نے ۱۶۹۰ء میں وہ زمین دریائے ہگلی کے کنارے انتخاب کی جس پر آج قلعہ فورٹ ولیم نظر آرہا ہے۔

(جلد دوم صفحہ)

اِن واقعات کے بعد یہ کہنا کہ اورنگ زیب تجارت کا حامی و مددگار نہ تھا سخت بے انصافی ہوگی۔ یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرکات کا ذکر تھا مگر ہندوستان صرف انگریزوں کا بازی گاہ نہ تھا بلکہ دوسری یوروپین قومیں بھی یہاں شکار کھیل رہی تھیں اور اُن میں قابل ذکر ڈچ ہیں جنکا ذکر باب نہم میں کیا جائیگا۔ یہ جو چند واقعات یہاں لکھے گئے ہیں یکے از ہزار و مشتے از خروارے ہیں تاہم انہیں واقعات سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ جو واقعات اس مضمون میں درج ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں اور ڈچوں نے اورنگ زیب کی حکومت میں کس طرح کی دشواریاں پیدا کرنی چاہیں مگر اورنگ زیب نے اپنے الطاف شاہانہ سے انکی خطاؤں سے چشم پوشی کی اور تجارت میں ہمیشہ ان کو مدد دی جس کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے ملک کو وہ تمول نصیب ہوا جس کا ذکر تجارت

تجارت کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ آج ان سب باتوں کو بھول جانا سخت ناشکری ہے۔

باب نہم

یوروپین تجار کی پالیسی و اخلاق

اس باب میں ایک کامیاب ڈپلومیسی اور بدترین اخلاق انسانی کے عجیب و غریب اجتماع کا ذکر کیا جائیگا اور یہ دکھلایا جائیگا کہ باوجودیکہ اس ڈپلومیسی کے عاملوں کی اخلاقی حالت کیسی کچھ متبذل اور دیانت سے دور تھی مگر اس نے کیونکر ایک ہندوستانی سلطنت کو مٹا کر اپنا منشاء پورا کر دکھایا یہ قدرت کا کرشمہ ہے جس سے ایسے عظیم الشان تغیرات ظہور پذیر ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے ایک سلطنت کا صفحہ ہستی سے مٹنا اور دوسری کا قائم ہو جانا۔ چونکہ اس ڈپلومیسی کی ابتداء عہد اورنگ زیب میں ہوئی لہٰذا اس کتاب میں اسکا ذکر کرنا ضروری تھا۔ شاید یہ ہی غلطی اورنگ زیب کی دوراندیشی کے خلاف تھی کہ بادشاہ موصوف نے اپنی تمام قوت کل ہندوستان کو ایک متحدہ بڑی ایمپائر Empire یعنے عظیم الشان سلطنت کی صورت میں مبدل کر دینے میں صرف کر دی اور ان کیڑوں کو نہ دیکھا جو کہ نظر سے دور رہ کر تہ میں اس بڑی سلطنت کی عمارت کی بنیاد کو کھود کھود کر کمزور کر رہے تھے

جس کو یہ بادشاہ اس شان و شوکت کے ساتھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اورنگ زیب نے اس دار فانی سے رحلت کی بظاہر عظیم الشان عمارت تو بنکر تیار ہو گئی لیکن چونکہ بنیاد تو کمزور ہو گئی تھی ایک تند ہوا کے جھونکے نے اسکو گرا دیا جس تدبیر سے یہ بنیاد کمزور کی گئی وہ ایسی ڈپلومیسی ہے جس کا نشانہ اس ملک میں کبھی خالی نہیں گیا ہندوستان کے اس حصہ تاریخ سے جو سبق ملتا ہے وہ کسی قوم و ملت کو نہ بھولنا چاہئے بلکہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ جو انسان اپنے گزشتہ تجربہ سے آئندہ کے لئے سبق نہیں حاصل کرتا وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار و ناکامیاب رہتا ہے اسی طرح سے جو قوم اپنی قومی سوانح عمری اور تاریخ سے سبق نہیں لیتی وہ ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

جس ڈپلومیسی کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جس سے سبق حاصل کرنا چاہئے وہ یہ تھی کہ دو قوتوں کو لڑا کر ایک قوت کا ہمدرد بننا اور اس سے سلطنت و حکومت میں کچھ حقوق حاصل کرنا پھر جب حاصل شدہ حقوق مستحکم ہو گئے تو اسی ڈپلومیسی سے آگے قدم بڑھانا اور نئے حقوق حاصل کرنا اسی طرح سے رفتہ رفتہ دونوں قوتوں کو مٹا کر خود بلا شرکت غیرے ملک کا بادشاہ بن جانا انسانوں کے کسی طبقہ کے عیوب بیان کرنا کوئی خوش کن کام نہیں ہے لیکن فلسفہ تاریخ سمجھنے کے لئے اور سبق حاصل کرنے کے لئے بعض وقت اسیے واقعات کا بیان کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بادی النظر میں سب سے پہلے اس ڈپلومیسی کی ابتداء ہندوستان میں ڈچوں نے

کی تھی۔ ہندوستان میں ڈچوں کی پالیسی کی بابت کپتان صاحب نے سنہ ۱۷۲۷ء میں جو خیال ظاہر کیا تھا وہ حسب ذیل ہے :۔

"اس ایماندار کمپنی نے ہمیشہ سے یہ قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اول تو وہ ہندوستانی"
"رئیسوں اور حکمرانوں میں لڑائی کرا دیتی اور پھر بڑے اظہار دیانت داری کیساتھ"
"اُن کے جھگڑے قضیئے چکانے کے لئے خود ثالث اور پنچ بن جاتی اور ہمیشہ میزان عدالت"
"کا پلہ اس کے حق میں بھاری کر دیتی جس کے ملک کی پیداوار یا جس کے ہاں کا مال"
"کمپنی کے لئے سب سے زیادہ کار آمد ہوتا تھا۔ اور ہمیشہ اُسی رئیس کو اسلحہ جنگ"
"سے مدد دیتی تھی جکو مدد دینا کمپنی کے مفید ہوتا اور جنگ ختم ہونے پر وہ"
"غریب مفتوح کی گردن پر ان تمام مصارف کا بوجھ ڈالتے تھے جو فاتح کی مدد"
"دینے میں عائد ہوتے تھے۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا اور عہد نامہ پر دستخط کرنے کا"
"وقت آتا تو کمپنی جو کہ دوستی کا دعوے کرتی تھی اپنے دوست کا بہترین بندرگاہ"
"معاوضہ میں لے لیتی۔ اس پر قلعہ بندی کرتی اور پھر سوائے ڈچوں کے دوسروں"
"کو اس بندرگاہ پر تجارت کی اجازت نہ دیتی اور اگر اس کے خلاف کچھ ہوتا تو"
"کمپنی کی فوج بہ شرکت کسی دوسرے دشمن کے اُس کے مقابلہ پر تیار کی جاتی"

(جلد اول صفحہ ۲۳۵)

کپتان ہملٹن کی رائے میں یہ طرز عمل ڈچوں کا اس ملک میں تھا لیکن میری رائے میں صرف ڈچوں کو اس غیر مستحسن پالیسی کا الزام نہیں دیا جا سکتا ممکن ہے کہ اسکی بنیاد ڈچوں ہی نے ڈالی ہو مگر رفتہ رفتہ تمام یوروپین قومیں اسی پالیسی پر عمل کرنے لگیں۔ مِنْ حَیْثُ الْاِنْسَانْ

ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسروں پر سیادت و فوقیت حاصل کرنے کا خیال جیسا کہ دو سو برس پہلے تھا ویسا ہی اب بھی موجود ہے ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اُن کے حصول کے طریقہ بدل گئے ہوں مگر خیالات و جذبات حرص و ہوا اور انسانی فطرت کا تقاضا آج بھی وہی ہے اسکو مذہب و قومیت سے بھی تعلق نہیں ہے مسلمان و عیسائی۔ انگریز و فرانسیسی سب اس انسانی کمزوری کے شکار بن چکے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسٹیٹسمین یعنے مدبرین و اہل سیاست کا اخلاقی دستور العمل ہر زمانہ میں ممبر پر بیٹھکر وعظ کرنے والوں سے بالکل جداگانہ ہوا کرتا ہے۔

سنہ ۱۶۸۰ء کے قریب جو خط ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں کے پاس بدیں مضمون آیا تہا کہ ہندوستانیوں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیکر جہاز و لایت کو بہیج دو اور پہر حکومت اورنگ زیب سے کسی نہ کسی طرح سے جنگ کی وجوہ پیدا کرکے روپیہ ہضم کر لو اس کا تذکرہ "باب ہشتم" میں کیا جا چکا ہے جس سے ثابت ہوا کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ طرز عمل بھی اسی پالیسی پر مبنی تہا جس کا اتہام کپتان صاحب نے ڈچوں پر اس وقت لگایا تھا۔

ایک مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۷۱۴ء میں:-

"زومرن کے راجہ نے ڈچ کمپنی سے جنگ کی جس میں انگریزی فیکٹری کے اعلےٰ افسر نے جو راجہ زومرن کا مشیر خاص تہا۔ آتش جنگ بھڑکانے میں بہت کچھ حصہ لیا" "اُسوقت تو ڈچوں کا قلعہ "فتح کر لیا گیا۔ لیکن پہر انگریز مشیر نے اپنا ہی جھنڈا"

اُس قلعہ پر نصب کروا دیا اور بالآخر نتیجہ میں اس بازی میں فرانسیسیوں ہی کو ہار ہوئی"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۳۱۴)

اسی طرح سے سیام میں جب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو یہ معلوم ہوا کہ کمپنی پر قرضہ بہت ہو گیا ہے تو انہوں نے دفعتہً کارخانہ کو محض اس لئے آگ لگا دی کہ شاہ سیام کی رعایا پر اس حرکت کا الزام لگا کر شاہ سے تاوان وصول کریں اور انکار کرنے پر جنگ چھیڑ دیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۰۰)

اس قسم کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں اور ڈچوں کی پالیسی میں کچھ فرق نہ تھا اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کے بعد ڈوپلے فرانسیسی گورنر اور کلائیو انگریزی گورنر کی سرگرمی اور زور آزمائی کی فتح اور شکست ہندوستان میں بس اسی غرض و غایت سے تھی کہ اس ڈپلومیسی میں کون سبقت لیجاتا ہے اور بالآخر اس پالیسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی گوئے سبقت لے گئی اور نتیجتاً انگریز اس ملک کے حکمران ہو گئے اس موقعہ پر مجھے خیال آتا ہے کہ تمدن ہند کے فرنچ مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ملک گیری انگلستان سے سیکھنا چاہیے اس نے ہندوستان کی مثال پیش کرکے لکھا ہے کہ انگریزوں نے یہ ملک ہندوستانیوں ہی کے خون اور روپیہ کی مدد سے فتح کر لیا اس ملک کے فتح کرنے میں جتنی بڑی بڑی لڑائیاں انگریز لڑے ان میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہیوں کا خون بہا تھا اور

اخراجات جنگ اسی ملک کے روپیہ سے ادا کئے گئے تھے نہ انگریزوں کا ایسا خون بہا جو بیان کے قابل ہو اور نہ انکے ملک کا روپیہ صرف ہوا اِس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک گیر کو ملک گیری کا مقصد اس طرح سے حاصل ہو سکتا تھا تو سیاسی حیثیت سے کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کرنا اُس کی بڑی حماقت ہوتی۔ ہندوستانیوں نے اگر اس کا مقابلہ عقل سے نہ کیا تو یہ اُن ہی کا قصور تھا اور اب بھی اگر ہندوستانی اس سے سبق لے کر عقل سے کام لیں تو انکو کوئی منع نہیں کرتا۔

یہاں تک تو کامیاب ڈپلومیسی کی نوعیت بیان کی گئی اب اُن حضرات کی اخلاقی حالت کو ملاحظہ فرمائیے جو اس ڈپلومیسی کی مدد سے ہندوستانی سلطنت کی بیخ کنی کر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس ملک سے ہندوستانی سلطنت اس وجہ سے نہیں گئی کہ اس کے دشمنوں میں کوئی خاص انصاف کا مادہ یا انسانی اخلاقی خوبیاں تھیں جنکے اثرات نے اُس سلطنت کو معرض زوال میں ڈالدیا تھا۔ کپتان ہملٹن کا تمام سفرنامہ میرے اس خیال کا شاہد ہے۔ اس زمانہ میں جو پورچگیز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے تھے اُن کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جو شخص اُن پر بھروسہ کرتا تھا اُس کو دہوکہ دینے میں وہ کبھی نہیں چوکتے تھے

(جلد دویم صفحہ ۷۷)

شاہ سنگو نے ایک پرتگیز کو اپنی فوج کا جنرل مقرر کیا تھا وہ اسقدر مغرور اور گستاخ ہو گیا تھا کہ ایک دن جب وہ ہاتھی پر سوار کسی دولہن کے مکان

اُس کے والدین کو مبارکباد دینے کے لئے گیا۔ دولہن کو دیکھکر ایسا مفتون اور ازخود رفتہ ہوگیا کہ وہ اُس ایک دن کی بیاہی عروس کو زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ (جلد دویم صفحہ ۳۸)

سمندر کے راستوں پر لوٹ مار کرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ (جلد اول صفحہ ۱۶۴)

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو اصل سنٹر یعنے مرکز تھے صوبہ بنگال میں کلکتہ اور صوبہ سورت میں ممبئی۔ بنگال میں مسٹر جوزف چناک ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ تھا اس کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنی تجارت کی منڈی کے لئے کوئی جگہ خود منتخب کرلے چنانچہ سنہ ۱۶۹۰ء میں اُس نے اُس مقام کو منتخب کیا جہاں کہ اب فورٹ ولیم کا قلعہ واقع ہے کپتان ہملٹن نے اس مسٹر چناک کے بڑے کرتوت اپنے سفرنامہ میں تحریر کئے ہیں۔ ایک مقام پر لکھا ہے کہ :۔

"مسٹر چناک نے اپنی بستی بسانے کے لئے یہ موجودہ زمین لے لی تھی اور یہاں وہ ایک والی ملک سے بھی بڑھکر خود مختاری سے بادشاہت کرتا تھا البتہ فرق اتنا تھا کہ سلاطین میں ہمدردی و انسانیت ہوتی ہے اور وہ اُسمیں مفقود تھی جب کبھی کوئی غریب ناواقف ہندوستانی اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا تو لزوماً اسکو سخت سزائے بید دیجاتی اور اس کے اس حکم کی تعمیل عموماً اُس وقت کی جاتی تھی جب وہ کھانے پر ہوتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے پاس اس مجرم کی گریہ وزاری میں اسکو خوشگوار سرود کا مزا آتا تھا۔ اس جگہ کے آس پاس بہت بڑا"

"آباد ہیں اور اُن میں مُردہ شوہر کے ساتھ بیوہ کا ستی ہوجانا مروج ہے مُغلوں"
"کی جنگ سے پہلے ایک مرتبہ مسٹر چناک نے اپنے معمولی باڈی گارڈ کے ساتھ ایک جوان"
"بیوہ کو ستی ہونے کی دردناک رسم ادا کرتے ہوئے دیکھا جس کے حسن و جمال پر وہ"
"ایسا فریفتہ ہوگیا کہ اُسنے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان جلادوں سے اس عورت"
"کو زبردستی چھین لاؤ جسکی تعمیل میں وہ حسینہ و جمیلہ زبردستی اسکے بنگلہ میں پہنچا دی"
"گئی جہاں وہ دونوں بہت برسوں تک محبت کیساتھ رہے اور اس عورت سے"
"کئی بچے بھی ہوئے۔ آخر کار مسٹر چناک کے کلکتہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد"
"مرگئی۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ عورت عیسائی"
"ہو جاتی اُس عورت نے خود مسٹر چناک کو شدھی کرلیا جس کے بعد مسٹر چناک میں"
"صرف اس قدر بات تو مسیحی عقیدے کے موافق دیکھنے میں آئی کہ اُس نے اپنی"
"بیوی کو اچھی طرح دفن کرکے اسکی قبر پر ایک گنبد تعمیر کرادیا اور جب تک زندہ رہا"
"بُت پرستوں کے دستور کے مطابق سال بسال ایک مرغ اس عورت کی قبر پر ذبح"
"کرکے اسکی برسی کرتا تھا۔ یہ واقعہ عام طور پر مشہور ہے اور مجھے معتبر ذرائع سے"

مجھ بزرگ فریا

کو خبر اع ملی ہے۔ ہندو اور عیسائی جو بمقام کلکتہ چناک کے قلعہ میں آباد تھے سب نے بیان تہا کہ یہ واقعہ بالکل سچ ہے۔

(جلد دو صفحہ ۸)

کوان

یہا

کا حال سنئے گلی کے قریب جو کالونی یا نوآبادی انگریز

نامی ایک شخص صاحب بنایا کرتے ہیں کہ :-

یہ ملازم رکھتی تو بھی

Fraubuzam کے جلسہ انتظامی کے ممبر بہت سے معاملہ اُن کی ماہوار سے

چھوٹے۔ دستاویزات

"کیا کرتے تھے مگر ان غیر شخصوں کے ستانے میں جو ان کے قابو میں آجاتے ہیں سب متفق
"اور یکدل ہو جاتے ہیں ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہیں
"حسب مرضی منافع کے ساتھ مال کی خرید و فروخت کریں بلکہ وہ مجبور ہیں کہ گورنر یا جلاس
"کونسل اپنی مرضی اور صوابدید سے جو قیمت مقرر کر دیں اسی پر بیع و شری کریں نرخ کے طور پر یہ بیوپاری
"اگرچہ پیشتر سے خرید و فروخت کی اجازت گورنر سے حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ ایک ناقابل معافی جرم قرار
"دیا گیا ہے کہ وہ ہوگلی جا کر مال کا نرخ بھی دریافت کریں" (جلد دوم صفحہ ۱۲ و ۱۳)

اگر کبھی کوئی مال فروخت کرتا یا روپیہ قرض دیتا اور پھر جاتا تھا کہ تقاضہ کرے تو بغیر دھکا و پھٹکار کے اسکی جان بری نہیں ہوتی۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۸)

اور یہ تو ایک بالکل معمولی بات تھی کہ فرنگی سیاح ہندوستانیوں کے رقص و سرود کے جلسہ میں جب مدعو کئے جاتے تھے تو وہ وہاں جا کر تہذیب اور شرم و حیا کو خیرباد کہکر طوائف سے ہوسناکی کی خواہشات کی تکمیل آزادی سے کرتے

(جلد اول صفحہ ۲۶۴)

یہاں تک بنگال کے انگریزی تجار کی اخلاقی حالت بیان کیگئی اب سمت بمبی کا حال سنئے بمبی کے مجلس انتظامی کا صدر نشین مسٹر چائلڈ Mr. Child نامی ایک شخص تھا جس سے اور ایک شخص مسمی کپتان تھار برن Captan Tharburn سے بگاڑ تھی۔ صدر نشین مذکور نے اسکے خلاف جھوٹے دستاویزات اور جعلی کاغذات بنا کر اسکی سب جائداد ضبط کر لی اور اس کو جیل خانہ بھیجدیا۔ اس کپتان کی بیوی پیسے پیسے کو محتاج ہوگئی بعض

دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی جعلسازیاں کی گئیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۵)

یہ مسٹر چاپلڈ جو کمپنی کا جنرل سمجھا جاتا تھا ایک شخص مسمی بوچر Bucher سے ناراض ہو گیا اور اس نے ایک بنئے کو اسپر متعین کیا کہ کسی طرح سے مسٹر بوچر کو زہر دیا جائے۔ یہ بنیا مسٹر بوچر کے ہندوستانی باورچی سے ملا اور مسٹر چاپلڈ کا مطلب حاصل کرنے کے لئے اُس کو روپیہ کا لالچ دیا۔ ہندوستانی باورچی نے بنئے سے تو وعدہ کر لیا مگر سفید سنکھیا اور روپیوں کی تھیلی جو اُس بنئے نے اسکو دی تھی وہ اس نے اپنے مالک مسٹر بوچر کے سامنے لیجا رکھدی۔ (کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷)

ایک شخص مسمی پٹیٹ (Mr. Petit) کو بحری قزاقوں نے گرفتار کر لیا تھا اور اس کا فدیہ یعنے زرمخلصی پانچ ہزار پونڈ قرار دیا تھا۔ مسٹر پٹیٹ نے سورت میں اپنے دوستوں کو روپیہ ادا کرنے کے لئے لکھا لیکن مسٹر چاپلڈ نے کسی بنئے کے زبانی قزاقوں کو کہلا بھیجا کہ مسٹر پٹیٹ بڑے قرینہ مالدار آسامی ہے اس سے پچیس ہزار پونڈ لئے بغیر مت چھوڑنا اس بنا پر قزاقوں نے زرمخلصی کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ یہ رقم مسٹر پٹیٹ ادا نہ کر سکا کوان چھ مہینے میں یہ بیچارہ قزاقوں کی قید میں مر گیا۔ یہ قزاق مرنا گالیاں دیتے تھے کہ اُس نے ان کو ایسی بری صلاح دی کہ اُن کے بھی گئے۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۸) پیر ملازم رکھتی تو بھی

یہ حضرت وہی مسٹر چاپلڈ ہیں جنکا تذکرہ باب مشتم اُن کی ماہوار میں

اور جن کو ڈائرکٹر نے یہ ہدایت بھیجی تھی کہ ہندوستانی تاجروں سے خوب روپیہ
اینٹھ کر جہاز ولایت کو روانہ کرو اور جنگ کی چھیڑ چھاڑ کرو۔ انہیں حضرات نے
(۳۵) دفعات کی شکایتی درخواست گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی جس کا
نتیجہ بھی باب ہشتم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اب دوسرے گورنر صاحب کے حالات سنیے
جس زمانہ میں سرجان گیر (Sir John Gayer) بمبئی میں ایسٹ
انڈیا کمپنی کی طرف سے گورنر تھے اُن دنوں ایک شخص اپنی چہاردہ سالہ
بیوی کو بمبئی میں چھوڑ کر کسی کام کے لئے چین گیا ہوا تھا۔ گورنر نے اُس عورت
کی شادی اپنے لڑکے سے کر دی اور سابقہ شادی محض اس بناء پر کالعدم قرار
دیدی کہ بمبئی میں وہاں کے قانونِ نافذہ کی رُو سے شادی کی توثیق کے لئے
گورنر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے جو اس شادی میں حسب قاعدہ نہیں
حاصل کی گئی۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۵)

کپتان ہملٹن کو اس گورنر کی نسبت یہ شبہ تھا کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے
کو اور اپنی بیوی کو عمداً کسی نہ کسی طرح سے گورنر سورت کا قیدی بنایا اور
اس میں اُن کی یہ مصلحت تھی کہ سورت میں قیام کرنے کا اُس کو موقع ملے
پھر وہاں وہ اپنا ذاتی سرمایہ کسی تجارت میں اچھی طرح لگا سکے۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

سرجان کے بعد سر نکولس ویٹ صاحب (Sir Nicholas Waite)
گورنر ہوئے۔ یہ ایسا نامی شخص تھا کہ خود کمپنی کے ملازموں نے اُس کو پکڑ کر

بہ حیثیت ایک قیدی کے انگلستان روانہ کردیا۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

یہ حالت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی سرزمین ہند پر تھی سمندر کی بابت کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہی یوروپین تاجر بعض اوقات دریائی ڈاکو بھی بنجایا کرتے تھے اور بڑے بڑے ستم ڈھایا کرتے تھے سورت کے حالات تحریر کرتے ہوئے کپتان موصوف لکھتے ہیں :-

"۱۶۹۵ء میں کپتان ایوری ایک بحری قزاق نے اس شہر کی تجارت و امن میں خلل ڈالا اور چار چھوٹے جہازوں سے حملہ کر کے دولت مغلیہ کا ایک جہاز لوٹ لیا جس سے بہت سارا سونا چاندی اور ایک مسلمان خاتون لوٹ میں اس کے ہاتھ آئی۔ جیسا کہ میں بسلسلہ بیان تجارت بحر احمر و میڈاگاسکر تحریر کرچکا ہوں اس وقت سے اس شہر کی تجارت کو بہت صدمے پہونچے ہیں"

(جلد اول صفحہ ۱۴۶)

عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے عام حالات کی بابت کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کمپنی کے عمال کے ہاتھوں اسقدر ظلم و ستم ہوتا تھا کہ نہ کسی آسمانی کتاب میں اور نہ کسی انسانی قانون میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان زیادتیوں سے باز رکھتا۔

(جلد دوم صفحہ ۸!)

جب کبھی رعایا مغلیہ انگریزوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھتی تو کمپنی کے عہدہ دار یہ کہکر کہ تمہاری تنخواہیں بہت زیادہ ہیں جبراً اُن کی ماہوار میں

آدھا سا جھا کر لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۴)

یہاں تک تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجار کی عام اخلاقی حالت بیان کیگئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اخلاقی حیثیت سے پورا آوا کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ جو لوگ کہ ان تاجروں کی اخلاقی حالت درست کرسکتے تھے یا جن کا کچھ اثر تھا وہ پادری صاحبان کا طبقہ ہوسکتا تھا لیکن کپتان ہملٹن صاحب کی رائے اس طبقہ کی بابت یہ تھی کہ جہاں کہیں اُنکے قدم پہونچتے تھے وہاں شراب خانے اور عیاشی کے اطوار بھی ساتھ ساتھ چلتے تھے اور وہ لوگ جو ابھی تک ان باتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے اُنکو بھی ان بدعات سے بچنا بہت دشوار ہوجاتا تھا۔

(جلد دوم صفحہ ۵ و ۶)

بصرہ کی تو یہ حالت تھی کہ علانیہ گرجوں میں شراب فروخت کرتے تھے اور جو رعایت گورنمنٹ اُنکے ساتھ مرعی رکھتی تھی اس سے یہ بدترین اور ذلیل ترین فائدے اُٹھاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۸۴)

گوا کے مشنریز کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی شخص ایک فرا سی چیز مثلاً مچھلی وغیرہ بازار سے خریدے اور پادری صاحب کو دینے سے انکار کردے۔ تو وہ اس کو مرتد قرار دیکر ذات سے باہر کردیتے تھے۔ اور پھر بغیر سیات پونڈ لئے شریک نہ کرتے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

لوگوں کو طرح طرح کی بازیگری و افسوں گری کے کرتب دکھا کر اپنا معتقد بنا لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۳)

اگر کوئی شخص گناہوں سے نجات حاصل کرنا چاہے تو وہ اسکو بہت آسانی سے خرید سکتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۲۴)

منگلور میں بعضے ایسے بے حیا تھے کہ اگر کچھ روپیہ ملتا ہو تو مسافروں کے واسطے عورتیں مہیا کرنے میں بھی اُن کو کچھ عار نہ تھا۔ اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر کچھ فائدہ ہوتا ہو تو چوری۔ قتل۔ یا زنا کوئی گناہ نہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۸۲)

انہیں کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا کے ریاکاروں کے طبقہ سے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۲۷ - ۲۴۷)

ہم کو ان واقعات کے بیان کرنے میں تکلیف معلوم ہو رہی ہے، لیکن ہم اس تفصیل کیساتھ مثالیں پیش کرنے کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ اگر صرف دو ایک واقعات بیان کئے جاتے تو ناظرین کو شاید یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ بد اخلاقی کی مثالیں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں لیکن جب حالت وہ تھی کہ جس کا بیان کیا گیا تو پھر اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو ڈپلومیسی اس ملک کے فتح کرنے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئی اس میں اصل

انصاف یا عمدہ اخلاقِ انسانی کو ابتداء میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ ڈپلومیسی بغیر ان اوصاف کی امداد کے کامیاب ہوئی۔ میں نے لفظ "ابتدا" عمداً استعمال کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان واقعات کو انگلستان کے اُن پاک نفوس سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و تعدی کا مسئلہ پارلیمنٹ اور اپنی قوم کے روبرو خود ہی پیش کردیا یا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے بعد جب ہندوستانی سلطنت مٹ چکی تھی اور انگریزی حکومت مستحکم ہوگئی تھی۔ ہندوستان کو بغرض حکومت بھیجے گئے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ظلم و تعدی کے رفع کرنے میں اور انصاف کے قائم کرنے میں کوشش کی۔ میں ظلم و تعدی کے ان واقعات کی نقل نہ کرتا لیکن کسی ملک کی تاریخ میں ایسے بڑے بڑے واقعات جن کا ذکر کیا گیا لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ قوموں اور اُن کی سلطنت کی زندگی و موت کے متعلق جو اصول قانونِ قدرت نے بنائے ہیں وہ صحیح طور سے اخذ کئے جاسکیں یا یوں کہئے کہ صحیح فلسفہ تاریخ تیار کیا جاسکے اور یہ ثابت کیا جاسکے کہ کس طرح سے بدترین اخلاقِ انسانی بھی بعض صورتوں میں کامیاب ہوتے ہیں گو کہ اُن کا انجام کچھ ہی ہو۔

باب دہم

ہندو مسلمانوں کا نقطہ نظر اور انہیں اتحاد کی تدبیر

مضمون باب دہم

پچھلے نو باب دراصل اس خاتمہ کے باب کی تمہید ہیں۔ اصل مقصود اسی باب کا لکھنا تھا۔ اس سے قبل کے ابواب میں صرف وہ مواد جمع کرنا منظور تھا جس سے ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے جسکا اظہار اس باب میں کیا جائیگا۔ باب ہذا میں تین امور پر غور کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ ہندو برادران وطن کو عہد مغلیہ کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ دوم یہ کہ مسلمانوں کو ہندو کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ اور تیسرا یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی بہترین تدبیر میری رائے میں کیا ہے؟

حصہ اول اہل ہنود کا نقطہ نظر

خلاصہ کی استدعا

قبل اسکے کہ میں اہل ہنود کے صحیح نقطہ نظر کے متعلق زبان کھولوں مجھ کو ناظرین معاف فرمائیں گے۔ اگر اس خاتمہ کے باب میں مختصراً ان واقعات کا اعادہ کردوں جنکے ثابت کرنے کی کوشش پچھلے ابواب میں کیگئی ہے کیونکہ دراصل انہیں واقعات کی مدد سے اہل ہنود کے صحیح نقطہ نظر کی بنا

رائے قائم کیجائیگی۔ پچھلے ابواب میں عہد اورنگ زیب کے ہندوستان کی تصویر کھینچنے کی کوشش کیگئی ہے۔ اسکے دو وجوہ تھے ایک تو یہ کہ عہد مغلیہ کے دور کا درحقیقت یہ آخری بادشاہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عہد مغلیہ کا یہ متعصب ترین مسلمان بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔

تعلیم

باب دوم میں دکھایا گیا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں صرف ایک ہی شہر ٹھٹہ میں مسٹر ہملٹن انگریزی سیاح نے چارسو درسگاہیں دیکھیں اور وہ اس حیثیت کی تھیں اور وہ انکو ایسی شان کی نظر آئیں جن کو وہ کالج کہتے ہیں کیا دنیا کا کوئی دوسرا حصہ اشاعت تعلیم میں اس سے زیادہ اس وقت مصروف تھا۔؟

مذہبی رواداری

باب سوم میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں ملک کی مذہبی رواداری و بے تعصبی کی یہ حالت تھی کہ ایک انگریز سیّاح کو مذہب کے اعتبار سے ہندو مسلمانوں میں امتیاز دشوار ہوگیا تھا۔ آج بھی ہندوستان میں لاکھوں روپئے کی ایسی جاگیریں موجود ہیں جو شاہان مغلیہ نے مندروں کی امداد کے لئے عطا کی تھیں خود اورنگ زیب کے متعلق جسکو بڑا متعصب کہا گیا ہے ابھی چند دن ہوئے ایک واقف حال مسلمان نے ہندو مسلمانوں کے بھرے مجمع میں یہ بیان کیا کہ صرف بنارس میرے ساتھ چلے چلو تو میں وہاں کے پجاریوں سے انکی اسناد نکلوا کے دکھادونگا کہ ان میں سے قریب قریب سب اسی بادشاہ کی عطیہ ہیں عیسائیوں کو بھی گرجے بنانے کی اجازت دیگئی تھی۔ اب ذرا اس زمانہ کی یورپ کی تاریخ پڑھیئے

اور وہاں کی مذہبی خونریزیوں سے ہند کی حالت کا مقابلہ کیجئے اُس وقت معلوم ہوگا کہ مذہبی رواداری کے معاملہ میں عہد مغلیہ نے اس ملک کو کہاں تک تیار کیا تھا۔

تجارت و تمول و فارغ البالی

باب چہارم میں ہند کی تجارت و تمول و فارغ البالی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ایک شخص عبدالغفار کا سرمایۂ تجارت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایۂ تجارت کے برابر تھا اور صرف احمد آباد و سورت کے تجارتی محصول کی آمدنی اسقدر تھی کہ اُس زمانہ کے انگریز سوداگر و سیاح کو بے اختیار رشک ہوا۔ اس زمانہ میں اشیائے مایحتاج کا نرخ بھی بتایا جاچکا ہے۔ تجارت، دولت اور فارغ البالی کے اعتبار سے اُس زمانہ کی دنیا کے کسی ملک کا مقابلہ ہند سے کرلیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ عہد مغلیہ میں تجارت کو کہاں تک فروغ حاصل تھا۔

انصاف و امن و امان

باب پنجم میں انصاف و امن و امان کے ضمن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک انگریز کی جسنے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سفر کیا تھا اور وہاں کے حالات کو بغور کامل دیکھا بھالا تھا یہ رائے ہے کہ مسافر بغیر جان و مال کے کچھ خطرے کے تمام ہندوستان میں اسوقت بآسانی سفر کرسکتے تھے ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہند کے دور و دراز مقامات سے دہلی تک خط پہونچنے میں صرف آٹھ روز صرف ہوتے تھے آپ خیال فرماسکتے ہیں کہ ایسا انتظام قائم رکھنے کے لئے نقل و حمل، سڑکوں اور راستوں کی حفاظت کے کیا کیا نہ انتظامات ہوئے ہونگے۔

صنعت و حرفت

اب صنعت و حرفت کے شعبہ کو دیکھئے۔ عہد مغلیہ نے ہند میں یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ صرف ایک شہر کے کارخانے میں پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے۔ یہ قصے کہانی نہیں ہیں تاریخی واقعات ہیں۔ المختصر یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی عینی شہادت کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۹۲۴ء میں جو بڑی نمائش دولتِ برطانیہ کے تمام ممالک کی ہوئی ہے اسمیں ہندوستان کے سکشن یعنے حصہ میں مجھ کو ہندوستان کی مصنوعات میں سے کوئی ایک بھی ایسی چیز نہ دکھائی دی جو عہد مغلیہ میں نہ بنتی ہو یا جسکا پتا نا عہد مغلیہ کے بعد اس ملک نے گزشتہ صدی میں سیکھا ہو۔ ان تمام واقعات اور امور کے متعلق باب ششم ملاحظہ فرمائیے۔

یوروپین تجار سے اورنگزیب کا برتاؤ

اگر ناظرین کو یہ معلوم کرنا ہے کہ اس ملک کی تجارت و تمول کے بڑھانے میں اور ایشیا و یورپ کو یکجا ملا دینے میں عہد مغلیہ میں کیا کیا کوشش کیگئی ہیں تو ذرا عہد اورنگزیب کے وہ حالات جن کی دستاویزی شہادت آج موجود ہے باب ششم میں ملاحظہ فرمائیں اسی باب میں انگریزی کمپنی کی اصلی خط و کتابت و اورنگزیب کے اصلی فرمان کی نقل کی گئی ہے۔

یوروپین تجار کی کم ظرفی

اگر ناظرین کو اُن مشکلات کا اندازہ کرنا ہے جنمیں عہد مغلیہ کا آخری دور پھنسا ہوا تھا اور اگر اپنے ملک کے عہدہ داران کے عادات و اطوار کا مقابلہ ان لوگوں کے کیرکٹر سے کرنا منظور ہے جنکی ڈپلومیسی (حکمت عملی) اور تدبیر نے سلطنتِ مغلیہ کی بیخ کنی کی تو باب نہم پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ خلاصہ ہے اُن واقعات کا جن کا تذکرہ پچھلے ابواب میں کیا

جا چکا ہے۔

کل ہند کو ایک ملک اور ایک متحدہ سلطنت بنا دیا

اب اِن تمام کوششوں کا مجموعی اثر ہندوستان پر کیا ہوا؟ میرا خیال ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ بالآخر کُل ہندوستان ایک ملک ہو جائے۔ اُس کا ایک تمدن ہو جائے۔ اُس کے بڑے بڑے پہاڑ اور دریا اسکے باشندوں کو جُدا نہ کرسکیں تو اس کی بنیاد قادر مطلق نے شاہانِ مغلیہ کے ہاتھوں سے ڈلوائی تھی اور اسکے فخر کا سہرا اورنگ زیب ہی کے سر پر زیب دیتا ہے کہ اسی بادشاہ اورنگ زیب کے آخری عہد میں ہند نے ایک متحدہ سلطنت واحد ملک کی صورت اختیار کرلی تھی مغربی ہند، مشرقی ہند سے اور شمالی ہند جنوبی ہند سے ملگیا تھا اسکے باشندے بہت کچھ خلط ملط ہو چکے تھے۔ تمام ہند مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر ایک تخت دہلی سے اسطرح وابستہ ہو گیا تھا کہ گویا سارا ہندوستان ایک ہی ملک ہے۔ صوبوں کی قریب قریب اسی تقسیم ہند پر آجتک عمل ہو رہا ہے۔

قوانین بنائے

آج برٹش انڈیا میں جو قانون مال و وصول مالگزاری رائج ہے اسکی نسبت کیا کسی کو انکار ہے کہ اسکا ڈھانچہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ ہمارے موجودہ حکمرانوں کو سلطنت کے ڈیزائن (Design) و نمونہ کے بنانے کی زحمت ہی نہیں برداشت کرنی پڑی بلکہ اُن کو بنی بنائی تیار عمارت ملگئی۔ البتہ حسب ضرورت وہ اسمیں ترمیم و تغیر و تبدل کرتے رہے ہیں اور مرور زمانہ اور رعایا کے تبدیلی خیالات کیساتھ ترمیم کرتی رہنی پڑیگی جیساکہ ہر سلطنت کو کرنا پڑتا ہے۔ سلطنت میں نصفت و عدالت

قانون شہادت و دیگر علوم سائنس کے وہ اصول جن سے اسپین کے فاتح عربوں نے یورپ کو مستفیض کیا تھا ہندوستان میں اُن کے رائج کرنے والے عہد مغلیہ کے حکمران تھے۔

ہند کا قدیم تمدن

ہم کو اس ملک کے تمدن سے ایک خاص اُنس ہے اُسنے نہ صرف روحانی تعلیم اور ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے تھے بلکہ فن حکمرانی میں بھی قدیم دنیا میں ایک خاص امتیازی رتبہ حاصل کیا تھا۔ ہماری رائے میں اس ملک کے لئے عرصہ تک وہی تمدن موزوں تھا مگر ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ تمدن ہند کی معراج ترقی کا آخری زینہ تھا۔ انسانوں کو بلحاظ انکے پیشہ کے مختلف طبقات میں تقسیم کر دینا اور پھر اُن میں طرز معاشرت کی ایسی آہنی دیواریں بنانا کہ آپس میں شادی بیاہ کھانا پینا تو درکنار محض چھو جانا بھی بعض اوقات معصیت میں شمار ہو یا حصول علم کے حق کو انسانوں کے مخصوص طبقہ یعنے برہمنوں میں محدود کر دینا یا غیر مذاہب کے افراد سے امتیاز و مغایرت برتنا یا تجارت و تحصیل علم کے لئے ممالک غیر میں سفر کرنے سے احتراز کرنا۔ یا صرف یہی نہیں کہ چودہ پندرہ برس کی بیوہ کی شادی نہ کرنا بلکہ اُس کو ستی کر دینا اور اسی قسم کے تمام روایات و رواج جو ہند کے قدیم تمدن میں داخل ہو گئے تھے سوسائٹی (Society) کی اُس حالت کے اعتبار سے جب اہل ہنود بطور آریہ قوم کے ابتداً اس ملک میں آئے تھے شاید ضروری و لازمی ہونگے لیکن آج یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ تمدن اپنی نوعیت میں ایسا تھا کہ ہندوستان کی روز افزوں ترقی کیساتھ دائماً قایم رہ سکتا تھا۔

قدیمی تمدن میں ضروری لوچ پیدا کر دیا

جس قدیم تمدن کا ذکر کیا جا رہا ہے ممکن ہے کہ وہ ویدانت کی تعلیم نہ ہو مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ تمدن ہند میں قایم ہو گیا تھا۔ میری رائے میں اس تمدن میں جو ضروری تبدیلیاں آج سرعت کیساتھ ہو رہی ہیں انکی ابتدا کرنے کا سہرا ابھی عہد مغلیہ کے سر پر بہتا نظر آتا ہے جب مسلمان اس ملک میں آئے وہ بھی یہاں اسیطرح بس گئے جیسے آریہ زمانہ کے اہل ہنود آباد ہو گئے تھے لیکن یہ اپنے ساتھ ایک دوسرا تمدن لائے جسکا خمیر انہوں نے اہل ہنود کے قدیم تمدن میں شریک کر دیا۔ جس تمدن کی رو سے کسی زمانہ میں ایک مسلمان کو ہندو کا چھونا تو درکنار ایک ہی ہندو مذہب کے بعض فرقے ایک دوسرے کو نہیں چھو سکتے تھے اس میں مسلمانوں نے یہاں آکر تغیر پیدا کرنا شروع کیا۔ اور عہد مغلیہ میں بالآخر یہ عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کے پڑوسی بنکر ایک ہی دیوار کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ہند کے کل بچوں کو ایک سطح پر لانے کی عملی ابتدا اسی عہد مغلیہ سے ہوئی تھی۔ اسی عہد مغلیہ میں تحصیل علم کے حق کا دائرہ وسیع کیا گیا اور کایستھوں کا شمار اہل قلم میں ہو گیا۔ چھوت کے رواج کے متعلق مہاتما گاندھی اور دیگر رہبران قوم کی تعلیم آج یہ ہے کہ وہ رواج اس ملک کی ترقی کے لئے زہر قاتل ہے۔ لیکن اس سبق کی الف۔ ب اہل ہند کو عہد مغلیہ ہی سے پڑھانا شروع کر دیگئی تھی ہر نئے رواج و فیشن کی ابتدا کسی سوسائٹی کی چوٹی سے ہوا کرتی ہے لہذا اکبر بادشاہ نے ستی کے قدیم رواج کو زبردستی موقوف کر کے ہندو مسلمانوں میں شادی کا رواج بھی قایم کرنا چاہا تھا اور اسکی ابتدا خود ہی کی۔ اصلیت یہ ہے کہ ہند کے قدیم سخت تمدن میں جو لوچ

آج نظر آرہا ہے اور جسکی وجہ سے ہند جدید تمدن کی روز افزوں ترقی کا بار برداشت کر سکتا ہے وہ لوچ عہد مغلیہ ہی سے برابر پیدا کیا جا رہا ہے تب کہیں یہ موجودہ حالت رونما ہوئی ہے۔ اس لوچ کے پیدا کرتے ہیں اب اُن موانع اور زحمتوں کا سامنا نہیں رہا جو ابتدا میں مسلمانوں کو اُس وقت پیش آئیں اور برداشت کرنی پڑیں جبکہ انہوں نے ہندؤں کی دیوار سے اپنی دیوار ملا کر رہنا شروع کیا تھا۔

بڑے بڑے شہر بسائے

اس عہد مغلیہ میں سرزمین ہند پر اتنے بڑے بڑے شہر آباد کئے گئے کہ جب لارڈ کلایو (Lord Clive) یا لارڈ وارن ہیسٹنگز (Lord Warren Hastings) (دونوں میں سے کوئی ایک جسکا پورا خیال مجھکو اسوقت نہیں آتا) شہر ڈھاکہ میں داخل ہوئے اور وہاں کی آبادی و تجارت کو دیکھا تو یہ کہا کہ لندن و ڈھاکہ میں صرف اسقدر فرق ہے کہ ڈھاکہ کی تجارت لندن کی تجارت سے کہیں زیادہ ہے۔ اُن بڑے شہرو میں سے بعض بعض آج بہت ہی پست حالت میں ہیں مثلاً شہر ٹھٹہ جو سندہ کا ایک زبردست شہر تھا جہاں چار سو درسگاہیں تھیں وہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ اب رہ گیا ہے یا شہر شادی آباد مندو جسکے خوشنما کھنڈر علاقہ ریاست دھار میں آج اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا اظہار زبانِ حال سے کر رہے ہیں ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے۔

عمدہ عمارتیں بنائیں

سرسینک آرٹ Saracenic Art کی کیسی کیسی خوبصورت خوبصورت محرابدار سنگ مرمر کی عمارتیں، وسیع سڑکیں -

کاروانسرائیں، کیسے کیسے باغات، آبرسانی کے عجیب و غریب ذرائع اور تالاب بنا بنا کر سرزمین ہند کو خوشنما و آراستہ کرنے کی کوشش اسی عہد مغلیہ میں کی گئی۔

دریا سے تجارت بڑھائی

ہند کے بڑے بڑے دریاؤں سے تجارت و آبپاشی کا کام لیا گیا۔ جو تجارتی جہاز ان دریاؤں میں دوڑا کرتے تھے انکا کچھ تذکرہ باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

پہاڑوں کو فردوس بریں بنایا
کشمیر کے حالات

زمین اور دریا کا ذکر ہو چکا اب اگر ناظرین کو اسکا اندازہ کرنا ہے کہ عہد مغلیہ نے بنی نوع انسان کی راحت و آرام میں اضافہ کرنے کے لئے پہاڑوں کو کسطرح زیر و زبر کیا اور ان جنگلوں کو جہاں شیر، چیتے، ریچھ، وغیرہ درندے رہا کرتے تھے۔ کاٹ کاٹ کر کیسی کیسی نئی بستیاں آباد کیں تو عالم تصور میں میرے ساتھ کشمیر کی جانب رخ کریں اور جموں سے لیکر سرینگر تک ڈیڑھ سو میل کی قدیم شاہی سڑک پر سفر کریں۔ راستے میں ویری ناگ۔ اچھل۔ اسلام آباد اور دوسرے آس پاس کے مقامات پر عہد مغلیہ کے تمدن کے آثار زیر زمین تو حماموں کی دبی ہوئی ٹونٹیوں میں اور بالائے زمین پرانے باغات ٹوٹے پھوٹے فواروں اور کہیں کہیں بڑے بڑے واٹرورکس کی صورت میں دیکھتے چلیں۔ سرینگر پہونچنے سے قبل راستے میں اس زعفران زار کی بھی سیر کرلیں جسکی جڑیں سرزمین ہند کو معطر کرنے کے لئے ایران سے لائی گئی تھیں اور اور جن کو دیکھنے کے لئے آج بھی دور دور سے سیاح جایا کرتے ہیں۔ سرینگر

پہونچکر پہلے اس نسیم باغ کو دیکھیں جہاں صدیوں کے پرانے چنار کے عظیم الشان و تناور درخت کھڑے ہوئے اپنے ایرانی النسل ہونے کا اظہار کر رہے ہیں یہ چنار کا درخت جسپر وادی کشمیر کو آج اس قدر فخر اور ناز ہے بلکہ وہ عزیز ہے کہ وہاں کے قانون کے بموجب اس کی شاخ کاٹنا بھی جرم ہے عہد مغلیہ ہی میں ایران سے لاکر یہاں لگایا گیا تہا۔

کشمیر کا قدیم کالج و دار الاقامہ

اس نسیم باغ میں مشرق رو کھڑے ہونے سے آپکی نظر بار بار دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر پڑیگی جس پر ایک عالیشان پختہ ویران عمارت دکھائی دے رہی ہے راستوں کے نشانات بھی نظر آئینگے۔ مگر وہاں کسی آدم زاد کی صورت نہ دکہائی دیگی۔ منظر دلفریب عمارت بہت بڑی لیکن ویران اور ہو کا عالم ہے۔ اسکے آس پاس بھی کوئی مکان نظر نہ آئیگا۔ ناظرین کا جی چاہیگا کہ اس کو قریب سے ایک نظر دیکھیں۔ لیکن کشتی کا کشمیری مانجی (ملاح) یہ مشورہ دیگا کہ وہاں نہ جائیے۔ وہاں جنات ہیں، بڑے بڑے زہریلے سانپ اور اژدہے ہر طاق و گوشہ میں پڑے سو رہے ہیں اور شیروں کا مسکن ہے ناظرین متحیر ہوکر دریافت کرینگے کہ آخر یہ عمارت کس غرض سے بنائی گئی تہی۔ زیادہ دریافت سے معلوم ہوگا کہ یہ وہ کالج ہے جسمیں پڑہنے کے لئے عہد مغلیہ میں دور و دراز کے سفر طے کرکے طلبا آیا کرتے تھے۔ اور جو محرابیں نیچے نظر آرہی ہیں وہ طلبا کا دار الاقامہ و بورڈنگ ہوس تہا۔ گہنا جنگل کاٹ کر وہ پہاڑ طلبا سے آباد کیا گیا تہا۔ ابہی تو اس سنسان عمارت کی خاموش دیواریں عہد مغلیہ

کی کوششوں اور تمدن کے نشانات کا کام دے رہی ہیں اور زبان حال سے اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا قصیدہ اور اپنی تباہی و بربادی کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں مگر کچھ برسوں کے بعد وہ دیواریں بھی جب مسمار ہو جائینگی اسوقت میری اس کتاب کے پڑھنے والے شاید یہ کہیں گے کہ یہ شخص نہ معلوم کس عمارت کا ذکر کر گیا۔

چشمہ شاہی جس پہاڑ پر یہ عمارت ہے اُسی کے نیچے سرینگر کا وہ مشہور و معروف چشمہ شاہی ہے جسکو شاہان مغلیہ نے ایک خوبصورت عمارت کی آغوش میں محفوظ کر کے ایک فوارے کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ عہد مغلیہ میں کشمیر کے چشموں کی حفاظت اور قدر و منزلت کا یہ ایک نمونہ مشتے از خروارے ہے۔

نشاط باغ و شعلہ ماہ باغات اس مقام سے دو تین میل کے فاصلہ پر عہد مغلیہ کے وہ باغات ہیں جن کو عوام الناس نشاط باغ و شالا مار (دراصل شعلہ ماہ تھا) کہتے ہیں۔ بہت زمانہ ہوا مجھسے سرینگر کے ڈائرکٹر (Director) صاحب زراعت نے جنکے چارج میں وہ باغات تھے یہ بیان کیا تھا کہ جب لارڈ منٹو وائسرائے ہند کشمیر تشریف لیگئے تھے تو انہوں نے عہد مغلیہ کے یہ باغات دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا۔ اسوقت یہ باغات بہت ابتر حالت میں تھے اسٹیٹ نے کچھ روپیہ صرف کر کے انکی درستی کرائی پھر بھی جابجا کیچڑ سے انکو گزرنا پڑا تھا اب تو میں نے انکو دیکھا کہ اچھی حالت میں ہیں مگر اُنکے پرانے در و دیوار اور درختوں سے انکے اصلی حسن کی صرف جھلک دکھائی دے رہی ہے کیونکہ اب

بنا جامہ پہنانے کی کوشش کیگئی ہے جن ڈاکٹر صاحب زراعت کا میں نے ذکر کیا وہ ولایت کے تعلیم یافتہ اور فن زراعت کے ماہر تھے وہ فرماتے تھے کہ اب ایسے باغات کا بنانا تو درکنار انکا قائم رکھنا بھی دشوار ہے ۔ ناظرین کے قیمتی وقت ضایع ہونے کا خوف میرے دل پر طاری ہے مگر میں عہد مغلیہ کے کشمیری باغات میں داخل ہو رہا ہوں اگر انکے بیان کرنے میں ذرا طوالت ہو جائے تو معاف فرمائیں ۔ ناظرین کے ذہن میں اگر ایسے ایک باغ کی بھی صورت آجائے تو وہ حضرات جنہوں نے کشمیر نہیں دیکھا ہے اُن تمام باغات کا تصور کر سکتے ہیں جن سے عہد مغلیہ میں وادیٔ کشمیر اسطرح آراستہ و پیراستہ کیگئی تھی جیسے کسی دلہن کو کوئی کامل مشاطہ بناؤ سنگھار سے سنوارتی ہے ۔ نشاط باغ خوشا لامار باغ میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے اُنکا پرانا پھاٹک، نقار خانہ زینہ اور دیواریں خاموشی سے اپنے تعمیر کرنیوالوں کی شان و شکوہ اور فراخ حوصلگی کی نسبت سرگوشی کرینگی مگر سامنے باغ کا نظارہ اتنا موقع نہ دیگا کہ اسطرف توجہ کیجائے اس منظر کا سماں یہ ہے کہ ایک پہاڑ کو چوٹی سے لیکر نیچے سڑک تک اسطرح تراشتے چلے آئے ہیں کہ اسمیں زینوں کی کیفیت و صورت پیدا ہو گئی ہے ۔ ہر زینہ نہایت وسیع اور بہت لمبا چوڑا ہے جس پر ایک خاص ڈھنگ سے چمن بندی کیگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ پر اسکی چوٹی سے دامن تک باغوں کے زینے بنا دئیے ہیں ۔ ان زینہ نما باغات کے وسط میں اوپر سے نیچے تک چار پانچ گز چوڑی پانی کی چادر ماہی پشت تراشے ہوئے

پتھروں سے گزرتی ہوئی ہر زینے پر اسطح گر رہی ہے گویا سبز مخمل کے فرش پر صاف و شفاف جالی کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ہر زینے پر جہاں یہ چادر گرتی ہے ایک حوض ہے جو اس پانی کو پہلے اپنے آغوش میں لیتا ہے اور پھر گویا فرط نشاط سے اسکو گھماتا، نچاتا، اور اڑاتا ہوا بارہ بارہ پندرہ پندرہ فٹ اونچا آسمان کی طرف اچھالتا ہے۔ یہی اس باغ کے فوارے ہیں۔ پھر یہ بہتا ہوا پانی دوسری چادر بنا اس سے نیچے والے زینے کے حوض میں گرتا ہے اور اسی قسم کی اٹھکھیلیوں میں مشغول ہوجاتا ہے۔ جیسے کہ اوپر تھا۔ چونکہ پانی برابر رواں ہے اسلئے اوپر سے نیچے تک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تمام چادریں اور فوارے ایک ہی ساتھ اوپر سے رقص کرتے ہوئے نیچے چلے آرہے ہیں اور بالآخر سب سے نیچے والے حوض سے گزر کر خدا حافظ کہتے ہوئے اس خوبصورت وسیع ڈل جھیل میں گر کر غائب ہوجاتے ہیں جو دامن کوہ میں انکو اپنی آغوش میں لینے کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ پانی کی اس چادر کے گرنے کی سریلی آواز اور حوض کے فواروں کی گنگناہٹ کشمیر کے ان خوبصورت رنگ برنگ خوش الحان طیور کو راگ سُر کا کام دیتی ہے جو آس پاس کے خوشنما خوشبودار درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے چہچہاتے ہیں اور بعض تو من وعن واقعی گاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نشاط باغ و شالامار باغ کا یہ پہلا سماں دیکھکر یقین ہے کہ ناظرین کی زبان پر کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

بے اختیار آجائے اور وہ اسکی واقعیت کی صدق دل سے تصدیق کریں
اب ناظرین باغات میں ٹہلتے ہوئے زینہ بہ زینہ پہاڑ کی چوٹی تک قدم بڑہائیں
اگرچہ راہ میں ہر چمن اور اسکی ہر کیاری آنکھوں کو ایسی مرغوب ہوگی کہ ہر قدم
پر قدم بڑہانے کو جی نہ چاہیگا اور ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کی کیفیت ہوگی ۔ مگر اس موقع پر ہم کو تو صرف عہد مغلیہ کا تمدن دکھانا مد نظر ہے
اسلئے ہم نئے پھولوں پر نظر بھی نہیں ڈالتے بلکہ جلدی سے چوٹی کے باغ
پر پہنچتے ہیں ۔ یہاں پہلے اُس کنجی کے انتظام کو دیکھئے جو تین سو برس قبل
اسطرح بنائی گئی تھی کہ ایک جنبش سے باغ کے تمام فوارے اور چادریں آناً فاناً میں
بند ہوسکتی ہیں اور دوسری جنبش سے پھر رواں ہوسکتی ہیں یہ ایسی حکمت تھی جس سے
پہاڑ کی چوٹی پر پانی کے قدرتی چشمہ کو قابو میں کرلیا گیا تھا ۔ اسکے بعد کچھ
اور سیر گاہوں کے نشانات و آثار پر نظر ڈالتے ہوئے پرانے سایہ دار چیز نما
چنار کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا لطف اٹھاتے ہوئے ان تیلی پتلی
سڑکوں پر (جو ایک بڑے حوض کو اقلیدس کی مستطیل و مربع شکلوں میں کاٹکر
اسکے اندر بنائی گئی تھیں اور جنمیں شفاف پانی کے فوارے ہر جانب طرح طرح
کے رقص کا سماں دکھارہے ہیں) چہل قدمی کیجئے ۔ بالآخر اُس چھوٹی سی

عمارت ہیں جو وسط حوض میں بنی ہوئی ہے اور جو اپنے محرابوں چھتوں اور مینا کاری کے کام سے سرسینک آرٹ (Saracenich Art) کا نمونہ ہیں آرام فرمائیے۔ اب اس سنگ مرمر کے تخت پر جس پر نور جہاں جلوہ افروز ہو کر مناظر قدرت کا تماشا دیکھا کرتی تھیں مغرب کی رخ منہ کرکے کھڑے ہو جائیے۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ پہاڑ کی چوٹی ہے سامنے اُن باغات کے زینے ہیں جنکا ذکر ہو چکا ہے انکے بعد صرف ایک سڑک درمیان میں ہے پھر میلوں تک اس ڈل جھیل کا پانی سطح پر انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آئیگا جسکی شفافی کی یہ حالت ہے کہ تہ میں مچھلیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور پانی کے اندر جو درخت اور بیل پھول ہیں بعض مقامات پر انکی پتی پتی دکھائی دیتی ہے (شکارہ میں چلتے وقت اس شفاف پانی میں آس پاس کے پہاڑوں اور باغوں کا جو عکس پانی میں لہراتا نظر آتا ہے اکثر میں اپنی نظر اُس سے منٹوں تک نہ ہٹا سکا) خیر اس تخت شاہی سے نظر اور آگے بڑھائیے اور سامنے دور گلمرگ وغیرہ کے برفانی پہاڑوں کو دیکھئے جنکی سفید برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اگر یہ وقت طلوع آفتاب کا ہے تو تصور میں ہر جگہ پر روپہلی افشان چھڑکی ہوئی نظر آئیگی اور اگر غروب آفتاب کا وقت ہے تو آپ جہاں کھڑے ہیں۔ یہاں سے لیکر برفستان تک یہ معلوم ہوگا کہ سنہری کرنوں اور نقش کا مینہ برستا ہے یہ مختصر بیان اس منظر کا ہے جو مینے اکثر نشاط باغ و شالامار باغ جا کر دیکھا ہے۔

نور جہاں کے مذاق کا عکس

نشاط باغ و شالا مار جنکا بیان ابھی ہوا دراصل نور جہاں نے تیار کرائے تھے۔ جہاں جہاں شیریں چشمہ معلوم ہوا یا جہاں پر لطف منظر دکھائی دیا وہاں اس مغلیہ خاتون نور جہاں نے اپنے خیالات و مذاق کا عکس باغات کی صورت میں اسطرح چھوڑ دیا کہ آج تین سو برس بعد بھی ہم اُس سے لطف اُٹھا رہے ہیں جب اس بڑھاپے میں ان باغات کے مناظر کا یہ عالم ہے تو جوانی میں دلفریبی کی کیا حالت ہوگی میں نے اس نمونہ کے باغات کے آثار ویری ناگ اور اچھبل وغیرہ مقامات پر بھی دیکھے ہیں۔ ان پہاڑوں سے کیا دلی تعلقات ہونگے جنہوں نے انکی یہ قدر و منزلت کرائی جسکا صرف خیال کرنے سے وجد آتا ہے غالبًا ایسے ہی وجد کی حالت میں عرفی نے کشمیر دیکھکر وہ قصیدہ لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

جامع مسجد

ناظرین کو عہد مغلیہ کی قدیم عمارت میں لیجائے بغیر میں سرینگر کے حالات ختم نہیں کر سکتا۔ سرینگر میں آج بھی مسلمان اُس جامع مسجد میں خدا کی عبادت کر رہے ہیں جو عہد شاہ جہاں میں بنی تھی اسکا پھاٹک اسکا صحن اور اسکی چھت کے ستون آج تک اُسکے بنانے والوں کے پاکیزہ خیالات اور اعلیٰ تمدن کا ثبوت ہیں ہر ستون دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلند دیوار درخت کا زبردست تنہ سالم کا سالم زمین میں نصب کر دیا گیا ہے

وہ کونسا جرثقیل تھا جو اُن ستونوں کو جنگل سے وہاں لایا۔ ہم گزشتہ تیس
چالیس برس سے ایسی عمارتوں میں لکڑی کے شہتیروں کے بجائے لوہے
کے گرڈر بلحاظ صفائی و سہولت استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن عمارت میں
ہم کو لوہے کی عمر ابھی پوری طرح معلوم نہیں ہوئی۔ تین سو برس کی پرانی
مسجد کے ان ستونوں کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عمارت میں
لکڑی کی عمر زیادہ پائیدار ثابت ہو۔ اس مسجد کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہی
کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے سرینگر کا دورہ کیا ہے تو وہاں کی رعایا
نے کچھ شکایتیں اُنکے حضور میں پیش کیں اُسپر ایک فرمان نافذ ہوا اور
یہ فرمان زبان فارسی میں اس پتھر پر بجنسہ کندہ کر دیا گیا جو مسجد کے پھاٹک
پر آج بھی نصب ہے اس کتبے میں منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم ہے جس کا
خلاصہ یہ مضمون ہے کہ "ما بدولت کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ
زعفران کی پتی چننے والوں کو اور شال پر سوئی کا کام بنانے والوں
کو بعض اوقات پوری مزدوری نہیں ملتی۔ لوگ اسکا اندازہ کر سکتے ہیں
کہ اس قسم کے کام کرنے والوں کی آنکھوں پر کسقدر زور پڑتا ہے۔ امید ہے کہ
آیندہ ایسی شکایات ما بدولت کے کانوں تک نہ پہنچنگی" ناظرین خیال کر سکتے
ہیں کہ رعایا کی رسائی اس بادشاہ تک کیونکر ہوتی تھی اور اس بادشاہ
کے دل میں اپنی رعایا کے ساتھ کس درجہ ہمدردی تھی اور اس کی تحقیقات
اور معلومات کی کیا حد تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ان مزدوروں اور کاریگروں
کو کیسی کچھ مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے اور اسکا انکی صحت پر کیا مضر

اثر ہوتا ہے لہذا اس نے محض کاغذ پر حکم لکھنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رعایا کی تکلیف کے دفعیہ کے لئے اپنا حکم ایک ایسے منظر عام پر کندہ کرادیا جو اسوقت تک اس کی بیدار مغزی کے ثبوت میں آفتاب بنکر چمک رہا ہے۔

میں نے ناظرین کا بہت وقت ضایع کیا جسکی معافی چاہتا ہوں لیکن میرا اصلی مقصد بغیر اس تفصیلی بیان کے شاید نہ حاصل ہوتا۔

کشمیر کا تمدن

اب ان تمام واقعات پر فلسفیانہ گہری نظر ڈالئے۔ سائنس یہ بتلا رہی ہے کہ ہزاروں میل کے لمبے چوڑے سمندر میں ایک کنکری چھوڑ دی جاتی ہے تو گو ہماری آنکھیں نہ دیکھہ سکیں مگر اس کنکری سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ اوسوقت تک ختم نہیں ہوتی جبتک اسکو سمندر کا کنارہ نہ ملے۔ اسیطرح اگر ہوا میں حرکت کے ذریعہ سے کسی مقام پر کوئی لہر پیدا کیجائے تو اُسکا اثر اس تمام کرہ ہوا پر پڑتا ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ وائرلس (Wireless) یعنے بغیر تار کے خبر پہونچانے کا طریقہ سائنس کے اسی اصول پر مبنی ہے۔ انسان کے دماغ میں بہت کم ایسے خیالات آتے ہیں جو اپنا کچھہ نہ کچھہ اثر اُسکی روح پر نہیں چھوڑ جاتے اسیطرح کوئی تمدن بھی کبھی کسی ملک میں وہاں کے باشندوں پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کیا ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ عہد مغلیہ کے بادشاہ کشمیر کو بہشت بنانے کی کوشش کریں اور اس سے وہاں کے لوگوں کا مذاق یا تمدن متاثر نہ ہو؟ میں جب کبھی نشاط باغ و شالامار کو جایا کرتا تھا تو مجھہ کو ایک بات ہمیشہ محسوس ہوا کرتی تھی کہ جمعہ کے دن سینکڑوں کشمیری معہ بال بچوں کے کشتیوں اور شکاروں

پر سوار ہو کر ان باغوں کو آتے ہوئے اور پھر وہاں دن بھر گزار کر شام کو ڈل جھیل کے راستے میں واپس جاتے ہوئے میں دیکھا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مذاق اُسی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ ثبوت کی ضرورت ہو تو اسی کشمیر کے پہاڑوں کی دوسری جانب تبت کی طرف جا کر جہاں عہد مغلیہ کے تمدن کا زیادہ اثر نہ تھا وہاں صنعت پر لہاسا پیٹرن (Lhasa Pattern) کے بجھے کہو پر نما ہیبت ناک جانوروں کی صورت لکڑی اور نمدوں پر بنی ہوئی دیکھئے اور پھر اُسکا مقابلہ کشمیر پیٹرن Kashmere Pattrn سے کریئے۔ لکڑی پر۔ پیپر مشی پر۔ شالوں پر قالینوں پر جہاں جہاں اہل کشمیر نے صنعت پر اپنا پیٹرن و نمونہ دکھلایا ہے وہاں خوبصورت خوبصورت چنار کی پتیاں اور نازک نازک پھول بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکی دستکاریوں میں وہ جھاڑ فانوس دکھائی دیتے ہیں جو ایران کی صنعتوں میں ہوا کرتے ہیں انکی زبانوں کو ایرانی کھانوں کا مزا عہد مغلیہ میں پڑا۔ اب کچھ ہی حالت ہو مگر کشمیر کے عمدہ باورچی کا یہ دعوےٰ رہا ہے کہ کسی دوسرے ملک کا باورچی اس سے بہتر و لذیذ کھانا نہیں پکا سکتا۔ ذرا غور کریئے کہ یہ ڈشز اور کھانے دراصل کس ملک کے ہیں میری رائے میں کشمیری کھانے دراصل ایرانی کھانے ہیں کشمیر کی دعوت پلاؤ سے شروع ہوتی ہے۔ اب تو انگریزوں اور انکے مقلد انگریزی دانوں کے نئے مذاق نے کشمیری باورچیوں کو فن طباخی اسطرح بھلا دیا ہے جیسے یورپ کے مشین کے بنے ہوئے سستے جامہ واروں نے کشمیر کی سوئی کی مہین دیرپا

اور خوشنما صنعت کو مٹی میں ملادیا سرینگر ایک وہ سرینگر تھا جہاں سے ۱۸۵۷ء تک کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی شالیں یورپ کے بازاروں میں جاکر فروخت ہوا کرتی تھیں اور آج وہی سرینگر ہے جسے سوداگر سوائے نمونوں کے عمدہ شالیں بناکر بھی اسلئے نہیں رکھتے کہ انکی مانگ نہیں ہے۔ نمونہ دیکھکر جب کوئی شخص خاص طور پر فرمایش کرتا ہے تب کہیں مہینوں میں ایک آدھ شال بناکر دیدیتے ہیں۔ اب تو کشمیر میں وہ پرانا کام نظر نہیں آتا۔ میرا اصلی پوئنٹ یہ تھا کہ عہد مغلیہ کے تمدن نے ہمالیہ کے پہاڑوں کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے اور کشمیریوں کی صنعت و حرفت، تجارت، دولت، پوشاک، غذا اور انکے کل مذاق و تمدن میں بہت کچھ تبدیلیاں اسی دور مغلیہ میں ہوئی ہیں۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھکر عہد مغلیہ کا مقابلہ اُس زمانہ کی تمام دنیا کی سلطنتوں سے کرلیا جائے تو ہندوستان دنیا کے کسی حصہ سے ترقی و تہذیب میں کم نہ پایا جائیگا۔

ہند کو مسلمانوں کے وجود سے فائدہ

ابھی تک اُن ترقیات کا ذکر کیا گیا جو ہند کی زمین اور دریاؤں اور پہاڑوں اور تمدن میں عہد مغلیہ نے کردکھائیں اب ہم اس ملک میں مسلمانوں کے وجود پر ایک سیاسی نظر ڈالنا چاہتے ہیں کیا اس ملک میں مسلمانوں کا وجود بالآخر مفید ثابت ہوگا؟ میری رائے یہ ہے کہ اگر ہند کی رگوں میں ترکستان۔ افغانستان و ایران و عرب کا خون شامل ہوگیا ہے تو اس امتزاج سے ہند کی اصلی اندرونی قوت میں اضافہ ہوگیا اور ہوتا رہیگا۔ بڑی بات جو ہند کو مسلمانوں کی آبادی سے عہد مغلیہ میں

حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ چنگیز خاں - تیمور بادشاہ کی طرح سیلاب کی صورت میں آکر پھر یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ مستقل طور سے یہیں بس گئے ہیں اور اس ملک کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا - انکی کوئی علیحدہ سول لائنس (Civil lines) اس طرح کی نہیں ہیں جیسے ہمارے موجودہ حکمرانوں کی ہیں - وہ ہند کے گوشت پوست اور خون میں شامل ہو گئے - مجھ کو تو معلوم ہو رہا ہے کہ جو قوت انگلستان کی اصلی سیکسن (Saxon) کو ان کی سرزمین پر یورپ کی مختلف اقوام کے بس جانے سے بالآخر حاصل ہو گئی وہی قوت اہل ہنود کو سرزمین ہند پر ایشیا کے مختلف مسلمان اقوام کے امتزاج سے بالآخر حاصل ہوگی - علی الخصوص جبکہ ان نئی آنے والی قوموں میں سے بعض ایسی ہیں جنکے آبا و اجداد وہی آریا تھے جنکی اولاد و اخلاف اور نسل میں ہونیکا فخر اہل ہنود کو ہے انگلستان کے باشندے اندرونی معاملات میں چاہے کتنی ہی جنگ کریں لیکن جب جرمنی کا مقابلہ پڑ گیا تھا تو انگلستان کی کل آبادی ایک سر سنگی تھی کیونکہ غیروں کے مقابلہ میں اغراض متحد تھے انسانی خلقت کا تقاضا یہی تہا - میری رائے میں ہند کی آخری حالت یہی ہونے والی ہے - آج ہر ملک کی قوت کا معیار اس ملک کی آبادی اور وہاں کے باشندوں کی جسمانی و دماغی قوت کا خزانہ قرار دیا گیا ہے جس اصول پر آج اسٹریلیا - کناڈا - نیوزیلنڈ وغیرہ نو آبادیات والے - اپنی قوت بڑہانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کر رہے ہیں اور یورپ کے باشندوں کو

اپنے ممالک میں لیجا کر بسانے کی کوشش کر رہے ہیں وہی مقصد ہند کو سینکڑوں برس ہوئے مسلمانوں کے آنے اور بس جانے سے حاصل ہو چکا ہے۔

پین اسلام ازم

لوگ بعض وقت پین اسلام ازم (Pan Islamism) کے خیال سے چوکنا ہو جاتے ہیں ہم اس باب کے حصہ دوم میں دکھلا دینگے کہ پین اسلام ازم ایک خیالی چیز ہے جس سے خوف کھانا فضول ہے۔

مسلمان کیوں آئے؟ بے سود بحث

ایک اور بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ آیا مسلمانوں کو اس ملک میں آنا چاہیئے تھا یا نہیں اسیطرح فضول ہوگی جیسے اس ملک کے ان اصلی باشندوں کا جو آریا قوم کے آنے سے قبل یہاں آباد تھے یہ اعتراض کرنا کہ اہل ہنود یہاں آکر کیوں بسے اور قابض ہوئے یا یوں کہئے کہ جیسے چھوٹے بھائی کے تولد ہو جانے کے بعد بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اعتراض کرنا فضول ہوگا مسلمانوں کو قدرت لائی یا شمشیر لائی یا ضروریات زمانہ لائیں کسی نہ کسی طرح وہ آگئے اور ہند کے گوشت و پوست میں شامل ہو گئے دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ آگئے تو مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے تمدن کو انکی ذات سے فائدہ پہنچا یا نقصان اور یہی دکھانے کی کوشش کیگئی ہے۔

مسلمان کے انحطاط کا اثر ہند پر

میرا خیال ہے کہ اگر کبھی مسلمان اس ملک سے نیست و نابود ہو گئے یا وہ اس قدر گر گئے کہ ان میں کوئی قوت باقی نہ رہی (گو کہ ایسا ہونا محال ہے) تو ہند میں بھی ایسا انحطاط پیدا ہو جائیگا

جیسے کسی شہ رگ کے ذریعہ سے جسم کا خون نکل جانے سے ہوتا ہے۔ دیکھ لیجیے جب اسپین مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور اسکی رگوں سے عرب کا خون ایک مرتبہ ملکر پھر نکل گیا تو جو انحطاط اسپین میں پیدا ہو گیا۔ اسکا علاج یورپ بھی آجتک نہ کر سکا۔ لیکن اگر مسلمان ہندوستان میں مثل اہل ہنود کے یہاں پھلتے پھولتے رہے تو اس ملک کی چپہ چپہ زمین کے لئے یہ اپنا خون بہا دینگے۔ اس پر غور کیجیے کہ جب ہند میں عہد مغلیہ کا دورہ تھا تو وہ ہندوستان کو ہر بیرونی قوت کی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رکھنے میں کوشاں رہے خواہ وہ بیرونی قوت افغانستان کی ہو یا ایران کی نادرشاہ کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی ہو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انکا اصل مفاد اسی میں ہے کہ ہند پر کسی غیر ہندی کا عمل دخل نہ ہو۔ مسلمانوں کے انحطاط سے اس ملک کی سپر کمزور ہو جائیگی۔

نقطۂ نظر وسیع ہونا چاہیے

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ عہد مغلیہ نے سرزمین ہند اور اسکے دریاؤں اور پہاڑوں میں کیسے کیسے بہترین تغیر پیدا کر دئے۔ اسکی تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثر پڑا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ہم یہ بھی بیان کر چکے کہ اس ملک کو مسلمانوں کے وجود سے کیا کیا فوائد نصیب ہوئے اور کیا کیا آئندہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

اب ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہندو برادران وطن کے لئے عہد مغلیہ کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کیا ہو گا۔ کوہ ہمالیہ کے ایک غار میں بیٹھکر اگر ہم ایک چیونٹی کیطرح رینگنا شروع کریں تو ہرچند

ہم کو تاریک و بدنما معلوم ہوگی لیکن اگر ہم کسی ہوائی جہاز میں بیٹھکر اُس عظیم الشان پہاڑ کی چوٹیاں، برفستان اور اسکا کل منظر مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو پھر اسکی چھوٹی چھوٹی بدنمائیوں پر نظر نہیں پڑتی اور وہ خوبصورت پہاڑ نہ صرف قدرت کا عجیب و غریب منظر معلوم ہوتا ہے بلکہ ہندوستان کی پشت و سپر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسیطرح اگر ہم عہد مغلیہ کے ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں تو ممکن ہے کہ بہت سے ٹکڑے بدنما معلوم ہونگے لیکن اگر اس کل عہد کے کارنامے جمع کئے جائیں یا اس عہد کی ایک پوری تصویر کھینچی جائے تو عہد مغلیہ بھی تاریخ ہند میں قدرت کا عجیب و غریب دلکش نظارہ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں عہد مغلیہ اسیطرح قابل فخر ہے جیسے عہد اشوک یا چندر گپت اُنکے زمانہ کی حالت کے اعتبار سے تھا۔ ویدوں کے زمانہ بلکہ اسکے بعد کی بھی مکمل صحیح تاریخ ہند مرتب کرنا تو دشوار ہے لیکن آج ہم عہد مغلیہ کے ہر کارنامہ کو پیش کرکے ہند کی تہذیب دولت، تجارت، مذہبی رواداری، انتظامات، عمارات، باغات، اور کل تمدن کا مقابلہ دنیا کے تمام ملکوں سے کرنے کو موجود ہیں۔ ہم اپنے موجودہ یورپ کے حکمرانوں کے سامنے اس عہد مغلیہ کے کارنامے اس امر کے ثبوت میں پیش کرسکتے ہیں کہ اگر ہم کو پورا موقع دیا جائے تو ہم دکھا دینگے کہ گو آج ہم بے بس ہیں اور موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنی اصلی قابلیت ظاہر نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم صدیوں اس ملک کی حکومت کا انتظام اوس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھہ کرچکے ہیں۔ میری

رائے میں اگر ہند کی کل تاریخ ایک مرصع زیور خیال کی جائے تو عہد مغلیہ اس کا وہ درخشاں اور شاندار کوہ نور ہیرا ہوگا جسکے نکال ڈالنے سے زیور کی خوبصورتی اور جگمگاہٹ ہی جاتی رہیگی۔ یا کم سے کم یہ ہے کہ بالکل درہم پڑ جائیگی۔

اہل ہنود کا صحیح نقطۂ نظر

میرے پاس اسوقت مسٹر جسٹس مہادیو گووند رینڈے کا وہ مضمون نہیں ہے جسمیں انہوں نے عہد مغلیہ کی نسبت اہل ہند کا اپنا نقطۂ نظر بتایا تھا لیکن جہاں تک میرا حافظہ مدد دیتا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہند کو اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کے لیے بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں اس معراج ترقی میں عہد مغلیہ بھی ایک ضروری منزل اور زینہ تھا جسکے طے کئے بغیر ہند اپنی موجودہ حالت پر نہیں پہونچ سکتا تھا۔ میں اس رائے سے بالکل متفق ہوں۔ عہد مغلیہ نے ہند کو اُس کے نصب العین ترقی کے قریب پہنچانے میں مدد دی ہے اور کبھی اُس میں ہرج نہیں ہوا عہد مغلیہ ہند کا وہ شاندار زمانہ ہے۔ جس پر اہل ہند کو فخر کرنا چاہئیے اہل ہند کو چاہئیے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان عہد مغلیہ کو اپنا عہد تصور کریں۔ یہ عہد غیر ہندی عہد نہ تھا اس عہد کا یہ مقصود نہ تھا کہ ہند کا مفاد کسی دوسرے ملک کے مفاد کا تابع ہو۔ عہد مغلیہ کی نسبت ہندو برادران وطن کا صحیح نقطۂ نظر یہی ہوگا۔

(باب دہم ۔ حصہ دوم)

مسلمانوں کا نقطۂ نظر

تمہید اب ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر کیا ہوگا۔

میری رائے میں فی الحقیقت اس کا فیصلہ تو اسی روز ہوگیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دیا تھا۔ لیکن بعض وقت کچھ تو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے اور بعض وقت غلط فہمی سے انکی سچی حب الوطنی کی نسبت شبہات کئے جاتے ہیں شبہات پیدا کرنے والا طرز عمل عموماً ان جذبات میں مضمر ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مسئلہ خلافت اور "پین اسلام ازم" "Pan Islamism" کے سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔ اور کسی عارضی جوش میں محض زبان سے یہ کہہ گزرتے ہیں کہ ہم مسلم پہلے ہیں ہندی بعد کو ہیں۔ بس یہی ہمارے وہ نمایشی جذبات ہیں جو بعض اوقات سیاسی مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہمارے صحیح نقطہ نظر پر جو ایک دوسرا مسئلہ ہے پردہ ڈال دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم اول اسی قسم کے جذبات کی واقعیت اور قوت پر ایک نظر ڈالیں گے تاکہ اس امر پر رائے ظاہر کرنے میں کہ ہندوستان کے متعلق ہمارا نقطہ نظر

کیا ہے بالآخر ہم کو مدد ملے اور اس کے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "سیاسی خلافت" سے ہماری کیا مراد ہے۔

سیاسی خلافت سے مراد

"سیاسی خلافت" سے مراد ہماری ایسی خلافت ہے جو تمام دنیا کی مسلم آبادی کی (خواہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی ہو یا غیر اسلامی مملکت کی) مرکزی قوت بنکر اسکی متحدہ قوت کو کل مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مفاد کے لئے استعمال کر سکے اور اپنے قبض و اختیار میں رکھے جس شخص میں یہ مرکزی قوت موجود ہو وہی سیاسی خلیفہ ہوگا۔ مسلمان خلافت کیساتھ "سیاسی" کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن ہم نے صرف اسی سیاسی مرکزی قوت کے خیال و تصور کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ بار بار مطول عبارت نہ لکھنی پڑے۔ لہٰذا جہاں کہیں ہم "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کریں گے ہماری مراد اسی قسم کی قوت سے ہوگی۔

"سیاسی خلافت" محال ہے

منجملہ اُن جذبات کے جو ہندوستان کے تعلق سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ سیاسی خلافت کا جذبہ بھی ہے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر غیر مسلموں کے دلمیں اس کا خوف ہو کہ مسلم اندرونی طور پر کسی سیاسی خلافت کی حمایت میں آکر اپنے اصلی وطن کے سیاسی مفاد کو پس پشت ڈال دینگے یا اگر کوئی مسلمان کسی ایسی خلافت کا خیال بھی دل میں لاتا ہو تو ہماری رائے میں یہ خوف اور یہ خیال دونوں ایک خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ عملی طور سے نہ کبھی ایسا ہوا

اور نہ ایسا ممکن ہے لوگ یہ کہیں گے کہ ابھی تک جو شخص مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا رہا وہ دراصل ایک سلطنت کا حکمران رہ کر رات دن سیاسی سمندر میں غوطہ زن رہا۔ پھر یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ "سیاسی خلیفہ" یا "سیاسی خلافت" کا خیال نقش برآب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ایسا بادشاہ خلیفہ تو ضرور کہلایا گیا لیکن اس میں سیاسی خلافت کی قوت یا خلافت کے اوصاف کبھی نہیں پائے گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تاریخ اسکی شاہد ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد جو چار خلفاء راشدین یکے بعد دیگرے ہوئے انکی نسبت تو کچھ شبہ نہیں کہ جو جذبات ان کے دلمیں موجزن تھے وہ صرف اشاعت اسلام کے تھے۔ دنیوی بادشاہت یا یوں کہئے کہ محض بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کا خیال ان پر غالب نہ تھا۔ مگر ان چار خلفاء کے بعد یہ حالت نہ رہی۔ جونہی اسلامی سلطنتیں بیرون حدود عرب قایم ہونا شروع ہو گئیں انہیں وہی حالت پیدا ہو گئی جو فطرت کا تقاضا تھا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ یہی پیشگوئی آنحضرت کی بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سلطنت کے اغراض و مفاد علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور پھر یہ محال ہو گیا کہ کسی ایک اسلامی سلطنت کا حکمران سیاسی امور میں کسی دوسری اسلامی سلطنت کی رائے و مشورہ کا محکوم اور پابند ہو۔ ایک بادشاہ خلیفہ تو کہلاتا رہا مگر اس میں سیاسی خلافت کی مرکزی قوت کبھی نہیں پائی گئی۔ یہ خلافت کبھی کسی اسلامی سلطنت کو دوسری اسلامی یا غیر اسلامی قوتوں کی دست درازی سے محفوظ نہ کر سکی

نہ کبھی یہ خیال تک ہوا کہ اُسکا زوال عین خلافت کا (جزو ہی سہی)
نقصان ہے - جب تاتاریوں نے بغداد کا پایۂ تخت الٹ دیا مصر و
اسپین تو کجا پڑوسی عرب تک امداد کو نہ پہونچے -

جب شہزادہ فرڈیننڈ اور ملکہ ایزبیلا کے عہد میں لاکھوں مسلمانوں
کے خون سے اسپین کے در و دیوار رنگین ہوئے اور اسلام کے لاکھوں
نام لیوا جلاوطن کئے گئے - لاکھوں کلمہ گویوں کو بالجبر عیسائی بھی بنایا
گیا اور بے شمار مسلمان آگ میں زندہ جلا دئے گئے اُس وقت کونسی
وہ مرکزی قوت تھی جو سپر بنی ؟

جب ہندوستان کے تخت تیموریہ پر یورپ کے سوداگروں اور ایسٹ
انڈیا کمپنی نے دست درازی شروع کی تب کوئی ایسی مرکزی قوت نہ
پائی گئی جو اُن کو روک سکتی - جب یہ اسلامی قوت بھی نیست و نابود ہوگئی
تب سرزمین یورپ پر خلیفۃ المسلمین کا وجود اور اُنکی حکومت یورپ
کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی میدان صاف پا کر پہلے زار
([illegible]) روس نے ابتداء کی - پچاس برس ہوئے جب قسطنطنیہ
کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا اور خلیفہ سلطان کو خواب غفلت سے بیدار کیا
اسوقت اُن کے پاس کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جس سے اُن کو
کچھ بھی مدد ملتی اور اُن کو ایک حد تک یورپ سے قدم ہٹانا پڑے -
پھر تو یورپ کی یہ مسلمہ پالیسی ہوگئی کہ ترکی کے قدم جس طرح جلد ہو سکے
[illegible] یورپ سے اکھاڑ دئے جائیں جب اس پالیسی کو اس قدر

نشو ونما ہوا کہ اولاً اٹلی نے اور پھر بلقان کی پانچ متحدہ قوتوں نے یورپ کی اندرونی کمک و مدد سے خلیفۂ اسلام کے نشانِ ہلالی کو نیچا دکھانا شروع کیا تو انگلستان جیسے مدعی بے تعصبی کا وزیر اعظم بھی اپنے جوشِ مذہبی کو روک نہ سکا اور عام جلسہ میں اسنے اسپر اظہارِ مسرت کیا کہ آج اسلام مسیحی ممالک سے رخصت ہو رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کے مسلمان سوائے تماشہ دیکھنے کے نہ کچھ کر سکتے تھے اور نہ کیا اور سلطان میں کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جو اس آڑے وقت میں کام آسکتی بالآخر خود یورپ کی قوتوں میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور خلیفہ نے جو یورپ کی پالیسی سے عاجز آگئے تھے اپنی آئندہ کی حفاظت اسیں ہی سمجھی کہ کسی قوت کا ساتھ دیکر خود اس جنگ میں کود پڑیں اس وقت دنیا کے مسلمانوں کی حمیت دینی دیکھکر جو کچھ سیاسی خلافت یا مرکزی قوت کی رہی سہی نمایشی دھاک یورپ میں تھی اسکی بھی قلعی کھل گئی سب سے پہلا ملک جس نے خلیفہ کا ساتھ چھوڑا وہ عرب تھا۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ سیاسی خلافت تو محال تھی ہی اور ترکوں نے اپنے سیاسی مفاد سے عربوں کو ہمیشہ دبایا بھی تھا۔ البتہ ہندوستان کے چند مسلمانوں نے غل پکار مچا کر معتد بہ رقم جمع کی مگر اس میں سے ایک جزوِ قلیل جنگ کے بعد ترکوں کو بھیجا اور باقی خود صرف کر لی جس پر لیپا پوتی کرنے کی کوشش کو دیکھکر اور بھی نفرت بڑھتی ہے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ وہ شخص جسپر سیاسی خلیفہ کے الفاظ کسی حد تک صادق آسکتے تھے اسکو خود ترکوں نے دار الخلافت سے خارج کر دیا

اور اسکی وہ سلطنت جو یورپ و ایشیا کے براعظم کا معتد بہ حصہ گھیرے ہوئے تھی سمٹ سمٹا کر انگورہ گورنمنٹ کی صورت میں ظہور پذیر ہو گئی الحاصل اب اس دنیا میں آج کوئی ایسا شخص بھی نہیں دکھائی دیتا جو اُس معنی میں سیاسی خلیفہ کہا بھی جا سکے جسکی تعریف ہم کر چکے ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو برس کی خلافت کی یہ مختصر حقیقت ہے اس کے ملاحظہ کے بعد کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ ابتداء کے چار خلفاء راشدین کے کے زمانہ کے بعد ان تیرہ سو برس میں جس جس بادشاہ نے مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا دعوےٰ کیا اُنہیں واقعی تمام دنیا کے مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی مرکزی قوت موجود تھی جس کو وہ سب کے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا تھا یا اُس نے کبھی واقعی اُس قوت کو استعمال کیا اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام عالم اسلام کی قوت و تمدن سے مسخر ہو گیا ہوتا۔ ہماری رائے میں یہ قصور محض خلیفہ کا نہ تھا بلکہ یہ امر بھی محال تھا۔ کیونکہ ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور اغراض علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات باہم متضاد ہوتی ہیں اور اس حال میں ہر دنیوی بادشاہ کا ہمیشہ یہی فرض ہوگا کہ وہ اپنی رعایا اور ملک کے مفاد کو بمقابلہ دیگر ممالک کے مفاد کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہوں ترجیح دے۔ یہ تو خیر بادشاہ کا فرض ہے لیکن بادشاہ کو چھوڑ کر اگر کسی ملک کے مسلمان باشندے بھی اپنے سیاسی مفاد اور اغراض کسی ایسے خلیفہ بادشاہ سے وابستہ کرنا چاہیں جو اُن کے ملک کا بادشاہ نہیں ہے تو وہ مسلمان اگر

خود مختار سلطنت بھی رکھتے ہونگے تو بھی کچھ عرصہ کے بعد اسی قسم کی حالت محکومی میں گرفتار ہو جائیں گے جیسا کہ اہل عرب عرصہ تک ترکوں کے ہاتھوں میں بادل ناخواستہ رہے اور اگر وہ مسلمان کوئی اسلامی خود مختار سلطنت نہیں رکھتے بلکہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ اس ملک میں آباد ہیں جیسا کہ ہندوستان میں تو ایسی صورت میں اس ملک میں ان کا بقاو وقیام ویسا ہی دشوار و محال ہو جائیگا جیسا کہ اجتماع ضدین کیونکہ ایسی صورت میں مسلم و غیر مسلم آبادی کے اغراض و نصب العین میں بین مغائرت ہوگی ہماری رائے میں سیاسی خلافت نہ کبھی تھی اور نہ اسکا قائم کرنا ممکن ہے اگر ہماری رائے صحیح ہے تو مسلمانوں کو سیاسی خلافت کا خیال دل سے نکال ڈالنا چاہئیے اور ہندوستان کے متعلق نقطہ نظر قایم کرنے میں اس خیال کو کچھ بھی دخل نہ دینا چاہئیے۔

خلافت بلا سیاست کا تصور

ہم یہاں کوئی ایسی مذہبی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے جسکا تعلق اس کتاب کے اصل مضمون اور مقصد سے نہ ہو۔ اس لئے ہم یہ مسئلہ اٹھانا نہیں چاہتے کہ بغیر کسی خلافت سے وابستہ ہونے کے کوئی مسلم آیا مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم صرف اسقدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں نے کسی مذہبی خلیفہ کو کھڑا بھی کیا تو اس کی وقعت اور حیثیت رفتہ رفتہ وہی ہو جائیگی جو مسیحی دنیا میں اب پوپ (Pope) کی ہے یا اگر وہ خلیفہ واقعی مقدس ہوا تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے اہل تشیع میں مجتہد العصر یا اہل تسنن میں کوئی پیر طریقت کہ جس سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھ لیا جائے یا

اُن کے حلقے میں صفائی قلب کی توقع سے کچھ لیے بیٹھا جائے۔ مگر میری رائے میں مسلمانوں کو اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ پہونچے گا۔ علاوہ ازیں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں بھی ہمارے ذہن میں بڑی بڑی دشواریاں آرہی ہیں جن کے بیان کرنے میں ہم کو اندیشہ ہے کہ ایک ایسی طولانی بحث میں پڑ جائیں گے جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہوگا اور یہ بحث حقیقی شاہراہ سے بھٹکا کر پیچیدگیوں کے دلدل میں پھنسا دیگی بہرکیف اول تو کوئی ایسا خلیفہ ہوگا ہی نہیں اور ہوگا بھی تو بلا کسی سیاسی قوت کے ہوگا جس کے خیال کا بھی ہماری رائے میں ایک ہند کی نسبت نقطۂ نظر قائم کرنے میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

خلافت کا عام تصور

اس وقت خلافت کا عام تصور ہمارے برادران اسلام میں یہ ہے کہ خلیفہ ایسا مسلم بادشاہ ہو جو جزیرہ نمائے عرب پر حکمران ہو اور اُسکی حدود سلطنت میں حجاز و شام۔ بیت المقدس فلسطین و عراق وغیرہ شامل ہوں اور وہ بادشاہ حج کے موقع پر یا کسی اور طریقے سے تمام دنیا کی مسلم آبادی سے تعلقات قائم کرے اور اپنی مرکزی قوت کو اسلام اور تمام مسلمانوں کے مفاد کے واسطے استعمال کر سکے۔ اس عام تصور میں اور ہماری اُس سیاسی خلافت کے تصور میں جسکا ذکر ہو چکا ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یعنے صرف اسی قدر فرق ہے کہ اسمیں چند ممالک اسلامیہ کی بادشاہت جزو لا ینفک ہے۔ ہماری تو یہ عین خواہش ہے کہ اُن تمام ممالک پر جو گہوارہ اسلام ہیں۔ جہاں کے

ذرّے ذرّے سے انوارِ اسلام منور اور جن کے در و دیوار سے اسلامی تمدن کے آثار ہویدا ہیں اور جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات و عتبات عالیات واقع ہیں وہاں پرچم اسلام لہرائے اور مسلمانوں کی حکومت قائم رہے کیونکہ فی الحقیقت ان ممالک کی اصلی بہبودی کے خواہاں جس طرح قدرتاً مسلمان ہو سکتے ہیں ویسے کسی غیر مذہب کے لوگ نہیں ہو سکتے ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ اسوقت انگلستان و فرانس نے ان ممالک میں اپنے اثرات کی جو باہمی تقسیم کرلی ہے اسکا اصل مقصد اپنے ممالک کو فائدہ پہنچانا ہے نہ کہ اُن ممالک کی رعایا کو باوجود اس تمنا و خواہش کے ہماری رائے یہ ہے کہ اِن ممالک میں جو مسلم بادشاہ یا قوت ہوگی اسمیں وہ مرکزی قوت پیدا ہونے کی امید نہ رکھنی چاہیے جس کا محال ہونا سیاسی خلافت کے ضمن میں ہم دکھا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر ہمارے برادرانِ اسلام خلافت کے اس عام تصور کو کچھ نتیجہ بخش سمجھتے ہیں تو جہاں تک ہندی مسلم متعلق ہیں وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں اُسی وقت مدد دے سکتے ہیں جب خود اُن میں کوئی قوت ہو اور اُن میں اُس وقت تک کوئی قوت نہ ہوگی جب تک وہ اپنے ملک ہندوستان کی سیاسی حالت اُس بلند و رفیع پایہ پر نہ پہونچاویں کہ بحیثیت ہندی ہونے کے اونکی کوئی قدر و منزلت ہونے لگے۔ لہذا مسئلہ خلافت کو خواہ ہم کسی پہلو سے دیکھیں مگر اس ملک کی سیاسی ترقی میں ہمارا نقطہ نظر وہی رہنا چاہیے جو یہاں کی غیر مسلم آبادی کا ہے۔

"پین اسلام ازم"

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں پین اسلام ازم کی ایک خطرناک قوت اسوقت پھیل رہی ہے اِس کی واقعیت کے معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ "پین اسلام ازم" Pan Islamism کس قوت کا نام ہے۔

اگر "پین اسلام ازم" سے یہ سمجھا جائے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں کوئی ایسی باہمی قرارداد ہے کہ ایک مقام کے مسلمان دوسرے مقام کے مسلمانوں کو عملی مدد دیکر اس دنیا میں کوئی غلبہ حاصل کرلیں تو بہ حیثیت ایک مسلم کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ہماری رائے میں جن غیر مسلموں نے پین اسلام ازم کی مہیب صورت دنیا کے سامنے پیش کی ہے یا تو وہ غلطی میں ہیں یا اسمیں کوئی سیاسی غرض اس مقصد سے مضمر ہے کہ خواہ مخواہ دنیا کو اسلام سے برگشتہ اور چوکنا رکھکر دنیا کو اسلام کی مخالفت اور اسکی بیخ کنی پر تیار رکھا جائے۔ لیکن اگر "پین اسلام ازم" درحقیقت اُس کشش کا نام ہے جو کسی ہم خیال یا ہم تمدن اشخاص کے درمیان عادتاً ہوا کرتی ہے تو پین اسلام ازم کا وجود ہے کیونکہ تمام مسلمان بعض اصولی باتوں میں ہم خیال بن جاتے ہیں اور ایک حد تک انمیں کشش محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کی موجودہ سوسائٹی مختلف قسم کی قدرتی کششوں کا نتیجہ ہے انسانی جماعتیں خواہ کلب، کینبے، یا کسی اور صورت میں ہوں وہ صرف مختلف

اقسام کی کششوں کی مثالیں ہیں۔ ہم مذہبی ہیں یہ بھی ایک کشش ضرور ہے اور اس کشش کی قوت کا معیار اُن افراد کے مذہبی خیالات کی قوت پر منحصر ہوا کرتا ہے جو اُن سے متاثر ہوں۔ یہ عام اصول انسانی خلقت کے ہیں کچھ مسلمانوں ہی سے مختص نہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ یہودیوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہم مذہبی کی کشش موجود ہے۔ اسی طرح ہم ملک ہونے کی بھی ایک کشش ہے جسمیں مذہب کو دخل نہیں ہوتا اس کشش کا پورا حس اسوقت ہوتا ہے جب ہم اپنے ملک سے باہر جاکر اپنے کسی ملکی فرد سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے یورپ کا سفر کرتے وقت جہاز میں قدم رکھتے ہی ہم نے دیکھا ہے کہ اس پندرہ روزہ سفر میں جو چھوٹی سی دنیا بحر ذخار میں چلتی نظر آتی ہے اس میں جو سوسائٹیاں فوراً بنجاتی ہیں وہ اسی ملکی کشمکش کے نمونے ہوتی ہیں۔ اس کشش کی ایک دلچسپ مثال مجھہ کو یاد آگئی۔ میں ایک مرتبہ رات کے وقت لندن کی انڈر گراؤنڈ (زیرزمیں) ریل میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک کنڈکٹر یعنے ریل چلانے والے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھنا شروع کیا جن لوگوں نے لندن کی انڈر گراونڈ ریلوں میں سفر کیا ہے وہی اسکا اندازہ کرسکتے ہیں کہ کنڈکٹر کسقدر عدیم الفرصت ہوا کرتا ہے اور ایک ایک دو دو منٹ کے بعد وہ کس طرح ہزاروں آدمیوں کی بہتی ہوئی زندہ دہار کے رخ بدلتا اور موڑتا رہتا ہے لیکن ملکی کشش اُسپر اسقدر غالب تھی کہ اس عدیم الفرصتی میں بھی وہ میرے پاس آیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ

ہندوستانی ہیں۔ جب اوس کو اس خیال کی تصدیق ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگا کہ میں بھی ہندوستانی ہوں۔ یہ کہکر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مجھے دیکھکر اسکو ایک خاص مسرت ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی طلبہ کا علیحدہ کلب اسی کشش کے اصول پر مبنی ہے خیر یہ سب مختلف قسم کی قدرتی کششوں کی مثالیں ہیں اور یہ جذب مقناطیسی اسوقت تک باقی رہیگی جب تک انسان کی خلقت قائم ہے۔ دیکھنا صرف اسقدر ہے کہ جو کشش ہم مذہبی ہونے کی مسلمانوں میں ہے کیا وہ سیاسی نقطۂ سے غیر مسلموں کے واسطے کچھہ پر خطر ہے۔ یا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی حبل المتین (مضبوط رسی) ہے جس کے بھروسہ پر وہ ہند کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں پین اسلام ازم کی مذہبی کشش غیر مسلموں کے واسطے کچھہ بھی پر خطر نہیں ہے۔ اور جو وجوہ ہم سیاسی خلافت کے محال ہونے کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں انہیں وجوہ پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کشش ایسی نہیں ہے جس کے بھروسہ پر ہم اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر کو بدل دیں۔

مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر

ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر یہ ہو گا کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے کو تمام برادران وطن کے ساتھہ ایک ہی کشتی میں بیٹھا ہوا تصور کریں۔ اور وہ کشتی ہندوستان ہے۔

جو طوفان اہل ہنود کو ڈبانے کی قوت رکھتا ہے وہی انکو غرقاب کریگا - اور جو امن و سکون اہل ہنود کو ساحل مراد پر پہونچائیگا وہی مسلمانوں کو دنیاوی گرداب ہلاکت سے بچائیگا اگر کوتاہ نظری سے کام نہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ہر باشندے کی ترقی و وقار کا عکس کسی نہ کسی حیثیت سے پلٹ کر دوسرے باشندوں پر بلا لحاظ مذہب و ملت پڑتا ہے ہم کو اس امر کا پورا احساس کہ ہندوستانی عزت و ذلت کا اثر ہماری ذاتی عزت و ذلت پر کہاں تک پڑتا ہے اُس وقت ہوا جب ہم نے ہندوستان کے باہر سفر کیا - ہم نے سنہ ۱۹۱۱ء میں ولایت سے واپسی کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ دکھایا تھا کہ حدود ہندوستان کے باہر ہماری تمام عزت و وقار کا معیار لفظ "ہندی" ہونے میں ہے ہر مقام اور ہر سوسائٹی میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ غیر ممالک میں پہلے لوگ اس کی جستجو کرتے ہیں کہ کون شخص کہاں کا باشندہ ہے اس کے بعد اُن کی نگاہوں میں اس کا وہی وقار ہوتا ہے جو اُس کے ملک کی سیاسی و تمدنی حالت کا ہے جہاں کا وہ مسافر اصلی باشندہ ہے اُسکی وقعت یا تو ایک دم اُنکی نگاہوں میں بہت بڑھ جاتی ہے یا وہ نظروں سے گر جاتا ہے - کوٹ، پتلون، ہیئت، صورت، وضع، قطع بلکہ ذاتی قابلیت بھی بالائے طاق ہو جاتی ہے سنہ ۱۹۲۴ء کے سفر میں بھی یورپ کے ہر مقام پر جہاں جہاں گئے ہم نے دیکھا کہ بہ لحاظ عزت ہم محض اپنے ہندی ہونے کی وجہ سے کہیں تو فائدے میں رہے اور

کہیں گھاٹے ہیں۔

یہ عزت و خفت ہندوستان کی نسبت ہر شخص کے خیال پر منحصر تھی۔ اس میں مذہب کا دخل نہیں تھا۔ مجھ کو خیال ہے کہ ولایت میں ایک انگریزی خاتون نے مجھ سے یہ کہا کہ ایک مرتبہ اس کے بھائی نے ہندوستان سے لچھمی کی ایک مورت اس کو بھیجی اور یہ لکھا تھا کہ ہندیوں کے اعتقاد کے بموجب جس شخص کے پاس یہ مورت رہیگی اسکو دولت ملیگی۔ اس پر خاتون موصوفہ نے مذاقاً کہا کہ اُن کو ابھی تک کوئی دولت نہیں ملی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے مگر کسی طرح انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب میں بھی ہندی ہوں تو اس عقیدہ کا قائل کیوں نہیں ہوتا۔ سر رابندر ناتھ ٹاگور نے دوسرے ممالک میں سفر کرکے جو سکہ اپنی علمی لیاقت و انسانی وقار کا قائم کیا ہے اس کا فائدہ بلالحاظ مذہب ہر ہندی کو پہنچے گا۔ اٹلی کے شہر وینس (Venice) میں ایک سوداگر نے اپنا قیمتی زیور بغیر فوری قیمت لیئے ہوئے ہم کو اس اعتبار پر دیدیا کہ ہم ہندی تھے اور کسی شہر کی دوسری دوکانوں پر ایک سوداگر نے یہ کہا کہ ایک ہندی مسافر نے جس زیور کے خریدنے کا وعدہ کیا اُسے چھ مہینے بعد لوٹتے وقت حسب وعدہ اس نے خریدا اور ہندیوں کی اسی ساکھ کی بناء پر اُسنے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ بھی خرید کا وعدہ کرلیں تو زیور کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائیگا۔ یہ کچھ یورپ ہی کی کیفیت نہیں ہے

بلکہ عراق اور حجاز و عرب میں بھی جو ہندوستانی مسلمان زیارات اور حج کی غرض سے جاتے ہیں انکو تمام عراقی اور حجازی عموماً ہنودی کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک ہندوستانی دوست نجف اشرف میں جبکہ وہ اپنے ساتھیوں کیساتھ راستہ سے جا رہے تھے کچھ عربوں نے اشارہ کر کے کہا "ھذا الشیخ الھنود"

مہاتما گاندھی کی روحانیت کی شہرت سے غیر ممالک میں ہر ہندی بلا لحاظ مذہب فخر کرنے لگتا ہے۔ انگلستان میں آپ کتنا ہی اکڑئے لیکن انگریزوں کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ہندی ہیں تو بلا لحاظ مذہب آپ کا وہی وقار رہ جاتا ہے جو ایک رعایا اور محکوم کا ہونا چاہیئے جنوبی افریقہ اور دوسری نوآبادیات میں آپ کتنا ہی سر پٹکیں لیکن وہاں آپ کا شمار بہ حیثیت انسان وہ اپنے مساوی درجے کے لوگوں میں اس وقت تک ہرگز نہ کریں گے جب تک کل ہندوستان کا سیاسی پایہ بلند نہ ہوگا امریکہ کے ہائیکورٹ میں اس امر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہندی اون کے ملک کا کبھی سٹیزن Citizen نہیں بن سکتا یا مستقل باشندے کے حقوق نہیں حاصل کر سکتا اُس ہندی کے مذہب کا خیال بھی اُن کے دل میں نہ آیا ہوگا جس کا مقدمہ اُن کے روبرو پیش تھا۔ ہم کو اس وقت کسی مذہب کی صداقت و کذب سے بحث نہیں ہے۔ یہ تمام مثالیں ثبوت میں پیش کیجاتی ہیں کہ بیرون حدود ہندوستان وہاں کے باشندوں سے ہمارا باہمی مذہب کا فرق اٹھ جاتا ہے اور غیر ہندی لوگوں کی نگاہ

"ہندی" محض "ہندی" ہی کی حیثیت سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے خواہ وہ کسی جامے میں ہو۔ ناظرین اس خیال کو دل سے نکال ڈالیں کہ ایک ہندی مسلمان اسلامی ممالک میں جاکر دائرہ ہندی سے نکل جایا کرتا ہے۔ نہیں وہاں بھی "ہندی" ہی رہتا ہے۔ میری والدہ و ہمشیر جب حج و زیارات سے واپس آئی تھیں تو فرمایا کرتی تھیں کہ انکے قافلہ میں جب کوئی ہندی کسی بدوی عرب کی کافی خاطر مدارات نہیں کرتا تھا یا کافی انعام نہیں دیتا تھا تو وہ "ہندی بطال" کے الفاظ بطور تکیہ کلام کے ہر ہندی کیلئے عام طور پر استعمال کرتا تھا اور اس ہندی کا مذہب اسلام اُس کو اذیت و تکلیف ہی سے بلکہ بعض اوقات قتل سے بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اسی سال کا واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ کے راستے میں ہزاروں حاجیوں کا قافلہ بدوی عربوں نے روک لیا اور جب انکو کافی رقم نہ پہونچی تو سارے قافلہ کو بغیر مدینہ منورہ کی زیارت کئے ہوئے واپس آنا پڑا۔ اور راہ میں ان مصائب کا سامنا ہوا کہ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ بدویوں پر مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔

سال گزشتہ سلطنت حجاز عرب کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مصری ڈاکٹروں کا وفد حاجیوں کے علاج و معالجہ کے لئے حج کے زمانہ میں زمین عرب پر قدم بھی رکھے یا خیمہ نصب کرے کیونکہ سیاسی حیثیت سے اُن کی موجودگی اُنہوں نے اپنے لئے مضر خیال کی تھوڑا عرصہ ہوا جب ہند کے وفد خلافت نے اسلامی جوش میں آکر مشورہ دینے کی غرض سے

سلطنت انگورہ میں داخلہ کی اجازت چاہی تو ترکوں نے صاف انکار کر دیا جس سے بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہونگی تین برس کا عرصہ ہوا جب صوبہ پنجاب وصوبہ سرحدی کے ہزاروں مسلمانوں نے ترک وطن کا خیال اس بھروسہ پر کیا تھا کہ افغانستان بحیثیت ایک اسلامی سلطنت کے اُن کا خیر مقدم اور آؤ بھگت کریگا اور اپنے ملک میں آباد کریگا۔ لیکن اُس ارادہ کو پورا کرنے میں جو جو نتائج پیدا ہوئے وہ ہر باخبر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ہمارے دوست خواجہ غلام الثقلین مرحوم کو ایک مرتبہ یہ جوش پیدا ہوا کہ ایران جاکر وہاں کے مسلمانوں کے خیالات درست کئے جائیں۔ اسلامی ہمدردی سے ایران پہنچے مرحوم میں ایثار نفس کا بہت مادہ تھا وہ فرماتے تھے کہ ایرانیوں کو ان پر یہ شبہ تھا کہ یہ شخص ہندوستان کی خفیہ پولیس کا کوئی رکن ہے اور ان کو پھانسنے کے لئے آیا ہے۔ انکی ہندیت نے ایران میں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غرض سخت مایوس ہوکر واپس آئے اگر ایران میں کوئی ہندی مسلمان اس طرح قتل کیا جاتا جیسے کہ ابھی چند دن ہوئے کہ ایک امریکن سفیر کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے کہ اسکی تلافی مکافات اور اُسکے خون بہا کے لئے ایران صرف مذہب کی بنیاد پر اس حد تک تیار نہ ہوتا جیسا کہ امریکہ نے ایران کو مجبور کرکے آمادۂ تلافی کیا۔ یہ سب صرف امریکہ کی سیاسی قوت کا زور اور اثر تھا۔ ان تمام مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندی مسلمان ممالک اسلام میں یا

بھی ہندی ہی رہتا ہے جس سے ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ معاملات دنیوی میں کسی ملک کی مجموعی سیاسی و تمدنی حالت کا جو اثر اس ملک کے ہر باشندے پر پڑتا ہے اس کو مذہب نہیں روک سکتا ہند کے مسلمان ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی سیاسی و تمدنی بہتر حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی حالت کو کسی اسلامی مقناطیسی اثر سے درست کر سکتی ہے۔ ایسا کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ قصہ کوتاہ سیاسی و تمدنی معاملات میں اہل ہنود و مسلمان ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ہند کی سیاسی ترقی مجموعی حیثیت سے مسلمانان ہند کے وقار و عزت اور قوت کو اسی طرح گھٹاتی اور بڑھاتی ہے جیسے غیر مسلم ہندیوں کی عظمت اور وقعت کو۔ پس ہمیں ہندوستان کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے اور ہمارا یہی نقطۂ نظر صحیح ہوگا۔

باہمی مطالبات کی نوعیت

ہم کو اس رسالہ میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر شخص کی نیت و غرض کا اثر اس کے افعال و معاملات پر کہاں تک پڑتا ہے۔ اس ملک میں ہندو و مسلمان ایک دوسرے کے مقابلہ میں بعض مطالبات پیش کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مطالبات نہ کئے جائیں۔ باہمی صفائی اور سمجھوتا اسی وقت کر لینا ضروری ہے۔ ہم نے اس پر خوب غور کیا ہے۔ باہمی مطالبات کے متعلق آج جس بات کو ہم لڑائی سمجھتے ہیں وہی آئندہ ہماری صفائی اور صلح کا باعث ہوگی لیکن ہماری رائے میں اگر ہندو مسلمان

ایک دوسرے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں جس کے قایم کرنے کی کوشش اس باب کے حصۂ اول و دوم میں کیگئی ہے تو پھر باہمی مطالبات کا فیصلہ کرنے میں بہت کچھ سہولت پیدا ہوجائیگی اگر تمام اہل ہنود مسلمانوں کو اس نگاہ سے دیکھنے لگیں کہ انکے عہد حکومت میں ہندوستان کے تمدن کو بہت کچھ فایدہ پہنچا ہے پس ملک کے اب جزو لاینفک ہیں یہ ایک ایسا ذخیرہ دماغی و جسمانی قوت کا ہیں جو اس ملک کی بہتری کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے (جیساکہ حصۂ اول میں مفصل طور پر بتایا گیا ہے) اور اسی طرح اگر تمام ہندی مسلمان یہ خیال کرنے لگیں کہ اُن کا وقار و ذلت اس ملک کے وقار و ذلت کے ساتھ وابستہ ہے اہل ہنود اس ملک کی صنعت و حرفت و دولت میں کوئی ایسی ترقی نہیں کرسکتے جس کا فائدہ صریحی یا معنوی طریقہ سے بواسطہ یا بلا واسطہ مسلمانوں کو بھی نہ پہنچیگا۔ خلافت و دین اسلام ازم آنکی آئندہ قسمت کا فیصلہ نہ کرسکیں گی اور اس کے جوش میں وہ کسی طرح اس ملک کی سیاسی ترقی میں سدراہ نہ ہونگے تو پھر ہماری نیتوں اور اغراض میں بہت کچھ یکسانیت پیدا ہوجائیگی ایک دوسرے کے مقابل سے شبہ کا بادل ہٹنا شروع ہوگا۔ باہمی تعلقات کا مطلع صاف ہوجائے گا اور ہم کو اپنے باہمی مطالبات کی نوعیت ایسی معلوم ہوگی گویا دو بھائی ہیں جو گھر کو بگاڑنا نہیں چاہتے بلکہ کچھ ایسا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں کہ عرصہ تک اپنی متحدہ قوت اس گھر کے

بقا و قیام کے لئے صرف کریں اسکو سجائیں اور اُس کی آرائشگی سے دونوں بھائی منتفع ہوں۔ ہمارا یہ گھر ہندوستان ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کے کل باشندے اپنے اپنے مطالبات کی نوعیت کو سمجھتے رہیں تاکہ اُن کا تصفیہ کرنے میں آسانی ہو۔ مطالبات اس نیک نیتی سے کئے جائیں کہ ایک کو دوسرے پر کوئی بیجا غلبہ نہ حاصل ہو دونوں کی بقا مقصد کی شرط ہے نہ ایک جانب ہندو راج کا خیال غالب ہو نہ دوسری جانب سیاسی خلافت کی دھن ہو اگر طبیعتیں اس رخ پر آجائیں تو بیڑا پار ہے۔ جو ہوا اس وقت چل رہی ہے اُسے دیکھکر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ایسی قوت و جذبات تمام دوسری قوتوں اور جذبات پر غالب ہوجائینگے اور اس سے کسی شخص کے اصلی اصول مذہب پر آنچ نہ آئے گی۔ فروعات کا کچھ ہی حشر ہو مثلاً یہ باجا بجانے کا مسئلہ یا کسی جانور کے ذبح کرنے کا حق ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک وقت آجائے کہ ایسے مطالبات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ لیکن آج تو صرف اسکی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مطالبات کی نوعیت کو نہ بھولیں۔

باب دہم ۔ حصہ سوم

نفاق کے نتائج و باہمی اتحاد کی تدبیر

تمہید

اگر شروع کے نو ابواب باب دہم کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں تو باب دہم کے حصہ اول و دوم کو اس آخری حصہ سوم کی تمہید سمجھنا چاہئیے۔ شروع کے نو ابواب میں صرف باب دہم لکھنے کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور باب دہم کے حصہ اول و دوم میں (جس میں ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بحث کیگئی ہے) اس آخری حصے کی بنیاد ڈالنا منظور تہا۔ اس میں اہل ملک کے سامنے باہمی اتحاد کی تدابیر پیش کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس مسئلہ پر اگر ناظرین میرے خیالات پوری طرح معلوم کرنا چاہیں تو حصہ اول و دوم کو پیش نظر رکھیں۔

عداوت و کینہ و نفرت کے جذبات کے نتائج

عداوت و کینہ اور نفرت انسانی خلقت کے بہت برے جذبات ہیں اور جب یہ کسی انسان میں سرایت کر جاتے ہیں تو ان کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ خلقت انسانی کے جزو یا طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کی قومیں اور جماعتیں ان ہی افراد سے بنتی ہیں۔ اسلئے جب کسی جماعت یا قوم میں کینہ و نفرت کا مادہ کسی دوسری جماعت اور قوم کے خلاف سرایت کر جاتا ہے

تو اُس کا دور کرنا بھی ویسا ہی سخت دشوار ہوتا ہے جیسا کہ کسی ایک فرد کے دل سے ان جذبات رذیلہ و مقتضیات ذمیمہ کا نکالنا اور جب کسی دو قوموں میں یہ صفات رذیلہ انتہا کو پہونچ جاتی ہیں تو اُس وقت اُن دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کا فنا ہو جانا ہی اُس کا علاج ہوتا ہے اسمیں ذرا شک نہیں کہ کینہ اور نفرت کی قوت کشش ہم ملکی و ہم وطنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمان و عیسائی گو صدیوں تک ایک ہی ملک اسپین میں رہے سہے لیکن اُن دونوں میں دوسرے کی طرف سے آتش نفرت بھڑکتی رہی۔ اسپین کے مسلمانوں کا فنا ہو جانا اُس کا علاج ثابت ہوا۔ اگرچہ ہر مورخ تسلیم کر رہا ہے کہ اُنکے فنا ہو جانے سے جو کمزوری اسپین میں پیدا ہو گئی وہ آج تک دور نہ ہو سکی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے کے واقعہ کو گو دو ہزار برس گزر گئے مگر جو اشخاص اس اندوہناک و ناشدنی فعل کے مرتکب ہوئے تھے اُن کی خاک کیا نام و نشان کا بھی پتہ نہ رہا ؎

پنداشت ستمگر کہ ستم بر ما کرد
بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

لیکن آج بھی روس، جرمنی، آزاد انگلستان اور امریکہ کے عیسائیوں کے دلوں میں گھس کر ذرا یہودیوں کی طرف سے اُن کے جذبات نفرت کا کوئی تماشہ دیکھیے۔ اسی سال لندن کی ڈبلی نمائش

میں ایک انگریزی عینک ساز نے ہمارے اعتبار سے بیجا فائدہ اٹھاکر ہم سے کچھ رقم وصول کرلی۔ جب ہم لندن کی ایک دوسری بڑی دوکان سے عینک خریدنے گئے تو اس دوکان کا مالک طیش میں آکر کہنے لگا کہ افسوس ایک یہودی نے آپ کو ٹھگ لیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر یہودی ایسا ہوتا ہے لیکن یہ صرف اسکی ایک مثال ہے کہ ایک غیر یہودی انگریز کا جذبہ ایک یہودی انگریز کے مقابل میں آج تک کیا ہے اور یہ کچھ عیسائیوں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حضرت عیسےٰ سے یہود کے سلوک نامحمود کا ہی یہ بھی نتیجہ ہے اور اثر ہے کہ آج عراق میں مسلمان بھی یہودیوں کو ایسا ہی برا سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جیسا کہ یورپ میں عیسائی۔ ہم مذہب اشخاص میں بھی اس بغض و کینہ و نفرت نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ خواہ یہ ہم مذہب عیسائی ہوں یا مسلمان۔ آخر جرمن و فرانس پڑوسی ہو کر بھی کیوں ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ آج یورپ کو اپنی تہذیب و تمدن پر فخر ہے لیکن وہ تمام تمدن و تہذیب اس کینہ و بغض و نفرت کے جذبات سے دیکر فنا ہوجاتی ہے۔ آئرلینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن چارسو برس سے کینہ و بغض و نفرت کی جو آگ اسکے شمالی و جنوبی حصوں میں بھڑکی ہوئی ہے۔ اسکے بجھانے کی تدبیریں بڑے بڑے مدبرین کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کی حالت بھی سب کو معلوم ہے قصہ کوتاہ ایک ہی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتوں میں ایک

دوسرے کے خلاف نفرت و کینہ کے جذبات کا پیدا ہو جانا اُس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہندوستان کی گزشتہ حالت اور آئندہ کے خدشات

عہد مغلیہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی جو حالت تھی اُسکی تصویر ہمنے باب سوم میں مذہبی رواداری کے سلسلہ بیان میں صفحات (۷) لغایت (۱۹) کھینچی ہے اور ہم کو خود اپنی زندگی کے اُن واقعات کا ہوش ہے کہ ہم اپنے ہم معمر محلہ و ہمسن ہنود بزرگ کا نام لیکر نہیں پکار سکتے تھے بلکہ اپنے بزرگوں کی تربیت کے اثر سے بلحاظ تفاوت عمر کسی ایسے رشتے سے منسوب کرکے مخاطب ہوا کرتے تھے۔ مثلاً چچا۔ دادا۔ بھائی وغیرہ۔ خیر یہ تو ہندوستان میں باہمی اتحاد کی گزشتہ حالت تھی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے حال میں اسوقت تک جو لڑائی جھگڑے ہندو مسلمانوں میں ہوئے ہیں اُنکی بنا اور نوعیت کے متعلق ہم اپنی مفصل رائے باب سوم کے آخری حصے میں ظاہر کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں ابھی تک فتنہ و فساد چند جاہل شریر النفس اشخاص کی ذات تک محدود ہے۔ ہم کو گلبرگہ دہلی یا امیٹھی میں ایسے جھگڑوں سے زیادہ خدشہ نہیں ہے کہ وہ تو ہوا کے جھونکوں کی طرح آکر چلے جائینگے جس سرزمین پر کروڑوں بنی نوع انسان مختلف الاقوام و المذاہب ایک دوسرے کی دیوار کے زیر سایہ آباد ہیں وہاں کبھی کبھی ایسا ہو جانا چنداں بعید نہیں ہے لیکن اطمینان بخش اور امید افزا بات یہ ہے کہ یہ جھگڑے دیرپا اور

مستقل نہیں ہوتے بلکہ جہاں کہیں آندھی کے جھونکے کیطرح چلکر کچھ اختلافی
جذبات کو اُبھار کر مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں وہاں بہت جلد امن
و سکون قایم ہو جاتا ہے اور روزانہ کاروبار دنیوی بدستور چلنے
لگتا ہے ۔ ایسے جھونکوں کی روک تھام تھوڑی سی انتظامی قابلیت سے
ممکن ہے اور یہ سب فروع ہیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے تو اسکا ہے کہ
کہیں یہ شعلہ بھڑک کر سوسائٹی کی تعلیم یافتہ اور بلند طبیعتوں کو مشتعل
نہ کر دے ۔ خوف ہے تو اسی چیز کا ہے کہ وہ دلوں میں جم کر نشو و نما
کرنے اور اُسکی جڑیں اور شاخیں نہ معلوم کہاں تک پہنچیں ۔ اگر تاریخی
غلط واقعات تعلیم یافتہ طبقے کے دلمیں جاگزیں ہو گئے اور اُن کے
دلوں میں اختلاف کی بارود بھر دیگئی تو پھر آگ کے لگانے کی بھی ضرورت
نہ ہوگی ۔ خود خیالات کی کشمکش اور جو طبیعت شعلہ ور ہوگی آتش فساد
مشتعل کر دیگی اور ہندوستان تباہ اور ہندوستانی جل بھن کر فنا ہو جائیں گے
اور یہ شعر صادق آئیگا ۔ ؎

شعلے بھڑک کے اُٹھے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جو ڈھانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے پچاس برس کی محنت سے تیار کیا ہے وہ
اک دم گر جائیگا ۔ ہندوستان میں اہل ہنود اور مسلمانوں کے اصلی تصادم
کی لہریں سمندر کے بڑے طوفان سے کم نہ ہونگی پھر یہ کہنا دشوار ہوگا کہ ہماری
کشتی اُس طوفان کے تھپیڑوں سے کیونکر بچ سکیگی اور منزل مقصود و ساحل مراد تک رسائی کیونکر

نصیب ہوگی ایک زمانہ میں تو یہ ممکن ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اسپین کو آٹھ سو برس کے بعد بھی چھوڑ دیا۔ لیکن اس زمانہ میں مسلمان اپنے وطن ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔ لہذا ہندو مسلمان دونوں بھائیوں میں مسلسل تصادم کی حالت قائم ہو جانے سے ملک کی جو حالت ہوگی اُسکے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر دوراندیش ہندوستانی سمجھ رہا ہے کہ مہاتما گاندھی صلح قائم کرنیکی کوشش میں کیوں اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہ اس تصادم کے نتائج کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ ہماری رائے میں اس وقت بھی کافی اتحاد موجود ہے اور جو کچھ بگڑے ہوئے تیور نظر آتے ہیں اُنکی اصلاح بھی ممکن ہے۔ مرض لاعلاج نہیں ہے پس ہم کو ابھی سے مؤثر تدابیر کو نہ صرف سوچنا بلکہ عمل میں لانا چاہیئے اور ہم کو علاج واقعہ قبل از وقوع باید کرد۔ پر کاربند ہونا چاہیئے۔

مستقل اتحاد کی اصلی تدبیر

ہماری رائے میں مضبوط بنیاد پر مستقل اتحاد قائم کرنے کی صرف ایک ہی یہ تدبیر ہے کہ ہندوستان کی صحیح تواریخ ہمارے ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائیں جن میں تعصب کو دخل ہو نہ غلط فہمی کا امکان اور وہی ہمارے نونہالان یعنے ہندو مسلمان بچوں کو پڑھائی جائیں کے جذب کرنے میں بچوں کے قلوب موم کی خاصیت رکھتے ہیں جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جائینگے۔ اور وہی شکل وصورت اختیار

کرلیں گے ۔ پس اس موم کے دلوں کو فولاد بنانا چاہیئے جو مضبوط ہو اور اسپر جو نقش ہو نقش کالحجر ہو ۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر بنیاد غلط پڑ گئی تو سارا مکان ٹیڑھا ہوجائیگا ۔ ؎

خشتِ اول گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اگر ہندوستان کی بہبودی پیش نظر ہے تو آئندہ نسلوں کے خیالات کی درستی کا انتظام آج ہی سے کرنا چاہیئے ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی تاریخ میں غلط واقعات درج کئے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ سچ سچ جو واقعہ ہو وہی لکھا جائے تاکہ تاریخ کی اصلی غرض اور گزشتہ انسویسے جو برے بھلے نتائج برآمد ہوتے ہیں اُن سے اطلاع ہو ۔ مورخ کا نقطۂ نظر ذرا بدل جانے سے پڑھنے والے کے دل پر اسکی تحریر کا اثر بھی بدل جاتا ہے خاص کر بچوں کے دل پر ۔ ہندوستان کی جو تاریخیں عموماً ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ہماری رائے میں غلط اصول پر مبنی ہیں ۔ کہیں تعصب ہے اور کہیں خودستائی اور دوسروں کی بھلائی کی بدنمائی اور اخفائے حقیقت ۔ اُن میں عموماً وہ واقعات نہیں لکھے جاتے جن کا لکھنا ہمارے نقطۂ نظر سے ضروری ہے ۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہتے کہ اورنگ زیب کی انسانی کمزوریاں نہ بتائی جائیں لیکن اعتراض یہ ہے کہ اُس کے عہد کی خوبیاں بھی کیوں نہیں بیان کیجاتیں ۔ اسکے علمی مذاق اور اُس کے زمانہ نہ

کی اشاعت تعلیم کا مفصل ذکر کیوں نہیں کیا جاتا جس کے کچھ حالات باب دوم میں لکھے گئے ہیں صرف ایک کتاب فتاوائے عالمگیری ہی کو دیکھیے کہ کس طرح کس محنت اور کن مصارف سے تیار کرائی گئی تھی اگر اورنگ زیب کے تعصب کا ذکر کیا جاتا ہے تو مذہبی رواداری کے معاملہ میں ملک کی اُس حالت کا ذکر بھی کیوں نہیں کیا جاتا جس کی کیفیت باب سوم میں مفصل بیان کیگئی ہے ۔ یہ بھی کیوں نہیں کہا جاتا کہ اُسکا ایک وزیر راجہ جے سنگھ اور فوج کا کمانڈر ان چیف راجہ رام سنگھ تھا اور اُس کا ایک فرزند شہزادہ اکبر ہندو رانی کے بطن سے تھا اورنگزیب نے اس سرزمین کی تجارت و تمول و فارغ البالی کی جو حالت پیدا کر دی تھی اور جسکی شہادت باب چہارم میں پیش کیگئی ہے اس پر کیوں مٹی ڈالی جائے اور وہ ہمارے طلباء کو کیوں نہ پڑھائی جائے ۔ انصاف وامن وامان کے متعلق جو حالات ہم نے باب پنجم میں لکھے ہیں اور صنعت وحرفت کی نسبت جو مواد ہم نے باب ششم میں جمع کیا ہے اگر یہ سب واقعات سچ ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ اُن تاریخوں میں بھی ہوں جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں تاکہ اُنکو معلوم ہو کہ عہد مغلیہ کی حکومت کیسی قابل قدر ہندوستانی حکومت تھی اُس حکومت کا مقصد ہندوستان کا فائدہ تھا اور اس سے واقعی ہندوستان کو فائدہ پہنچا ۔ کیا انصاف کا خون ہوگا اگر اُس شریفانہ وشائستہ برتاؤ کے ذکر کرنے کی بجائے جو اورنگ زیب نے ہمیشہ یورپ کے تجار کیساتھ

کیا اور جبکی تحریری شہادت کا حوالہ باب ہشتم میں دیا گیا ہے یہ کہا جائے
کہ اورنگ زیب نے غیر ممالک کے سوداگروں کو تجارت کرنا دشوار
کر دیا تھا جیسا کہ رسالہ "زمانہ" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے اور
جس کا حوالہ باب اول میں دیا گیا ہے اور یہ یوروپین تجار کے ساتھ
اورنگ زیب کا برتاؤ دکھانے میں خود اُن تجار کی اُس اخلاقی حالت
و پالیسی پر پردہ ڈالا جائے جس نے ہندوستانی بادشاہ کو ہندوستان
میں بادشاہت کرنا دشوار کر دیا تھا جس کی مفصل کیفیت باب نہم میں
دکھلائی گئی ہے۔ جو تاریخیں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اُن میں اورنگ زیب
شاہجہاں و داراشکوہ کے باہمی دادویچوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے
تعلقات کی اندرونی زندگی بھی دکھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن
سادہ فقیرانہ زندگی اور خدا پرستی کا ذکر بالکل ہی نہیں یا اس قدر
کم اور وہ بھی اس سلوب سے کہ عدم و وجود یکساں ہو۔ کیا جاتا ہے کہ
شاہان مغلیہ کے درشن کا طریقہ موقوف کرایا۔ دربار میں رقص و سرود
و عیش کے مشاغل بند کرا دئیے۔ محکمہ احتساب قائم کرا دیا اور خود
اپنے جیب خاص کے مصارف کی رقم کو بھی کم کرا دیا۔ اورنگ زیب اور
مرہٹوں سے جو لڑائیاں ہوئیں اُن کا تو مفصل حال بیان کیا جاتا ہے
لیکن اس کا بہت کم ذکر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی رعایا کے آرام
و فلاح و بہبودی و دلجوئی کے لئے کون کون ٹیکس موقوف کئے تھے اور
عہدہ داروں کی نذر اور ضبطی مال کے قواعد میں کیا کیا ترمیم کی تھی

ٹھگی ڈکیتی کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان ہمیشہ ٹھگی ڈکیتی کا جولانگاہ تھا لیکن اس کا ذکر نہیں کیا جاتا کہ ٹھگی کن صورتوں میں اور کیونکر ہندوستان میں رائج ہوئی اور اسکی اصل ذمہ داری کس پر ہے اور کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے پہلے بھی ان ٹھگوں کا وجود تھا۔ ہر سلطنت میں خوبیاں اور برائیاں دونوں جیسی اور جو کچھ ہوں اگر کوئی مورخ بیان کردے تو شکایت نہیں لیکن اگر کوئی مورخ کسی سلطنت کے نقائص تو بڑے زور داراور موثر الفاظ میں پیش کرے اور فوائد کا حوالہ دبی زبان سے دھیمے لفظوں میں دیکر یا اُن کو ترک کر کے آگے بڑھ جائے تو اس سلطنت کے نقائص ظاہر اور فوائد جیسا کچھ تاریخ سے جانے سے ظاہر ہوں گے ۔ نتیجہ برعکس ہوگا ۔ ہماری رائے میں جو تاریخیں نصاب تعلیم میں مقرر کیجاتی ہیں اُن سے بہت کچھ نقصان پہنچ چکا ہے اور آئندہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے اور ہر شخص ادنیٰ غور و فکر سے اس کو دریافت کر سکتا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تاریخوں میں سب واقعات غلط لکھے ہیں لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ واقعات پورے پورے نہیں لکھے جاتے اور صحیح اسلوب میں بھی نہیں لکھے جاتے ۔

جسطرح عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ ہندو بچوں کو پڑھانے کی ضرورت ہے اسی طرح مسلمان بچوں کو بھی ہندو پیریڈ (عہد ہنود) کی صحیح تاریخ اور صحیح واقعات سے آگاہ کرنا لازم ہے اگرچہ اس زمانہ کے حالات کا

پورا مواد و ماخذ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن جس قدر ہے وہ ایسا ہے کہ ہر مسلمان بحیثیت ہندی ہونے کے اُس پر فخر کر سکتا ہے۔ عہد ہنود کی دولت ثروت، تمدن، اخلاق تعلیم و علمی ترقی وغیرہ کی نسبت صحیح تاریخی حالات ایسے پیرایہ میں لکھے جا سکتے ہیں کہ اُنکا اثر مسلمان بچوں کے دلوں پر خاص طور نقشے سے پڑے۔ مہابھارت۔ رامائن۔ بدھ اور اشوک کے زمانہ کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تاریخ ہند کے دس پانچ صفحے میں لکھکر ختم کر دیئے جائیں۔ ہمارے لڑکوں کا کیرکٹر بھی ہندوستان کے ایسے مشہور و معروف ارواح کے حالات سے بہت کچھ درست ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ہمنے ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے متعلق حصہ اول و دوم میں لکھا ہے اگر ہماری وہ رائے صحیح ہے تو پھر جو تاریخیں ہمارے بچوں کے نصاب میں مقرر کیجائیں وہ اسی نقطۂ نظر سے لکھی جانی چاہئیں بڑی بڑی فلسفیانہ و علمی تاریخیں سن رسیدہ اشخاص اور منتہی طلبا کے لیے خواہ کوئی مورخ کسی طرح لکھے سن تمیز و تنقید کو پہونچکر ہر شخص صحیح و غلط۔ واقعیت اور تصنع میں امتیاز کر لیگا مگر بچوں میں یہ قابلیت کہاں ہے اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ہی گہوارہ محبت میں پرورش پائیں اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب اس ملک کی صحیح تاریخ بچوں کو پڑھائی جائے۔ اب صیغہ تعلیم ہندوستانیوں کے سپرد ہو چکا ہے ہر ہندوستانی منسٹر یا وزیر کا فرض ہے کہ جو تاریخ بچوں کے نصاب میں مقرر ہے اُس کو خود ملاحظہ فرمائے اور باخبر اصحاب

اور انعام میں ونکتہ رس اشخاص سے انکی جانچ کرائے اور اگر ذرا بھی اُس میں تعصب کی بو موجود ہو تو اُن کو نامنظور کردے بلکہ ہر صوبہ میں ایک انعام دس ہزار روپے کا مقرر کیا جائے کہ سر رشتہ تعلیم کا متعلق یا غیر متعلق جو شخص ہندوستانی لڑکوں کے پڑھنے کے لئے سب سے اچھی تاریخ اُس نقطۂ نظر سے لکھیگا جس کو ہم اپنے ملک کی بہبودی کیلئے اور آئندہ نسلوں کے واسطے مفید پائیں گے وہ اس انعام کا مستحق ہوگا اور پھر چند سال تک ہی تاریخ ہمارے بچوں کو اسکول میں پڑھائی جائیگی بہر کیف ہماری رائے میں مستقل اتحاد قائم کرنے کی بڑی تدبیر یہی ہے کہ ہمارے ہندو مسلمان بچوں کے واسطے صحیح تاریخ ہند نصاب تعلیم میں داخل ہو۔

اِتحاد کی دیگر تدابیر

ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی اصل تدبیر تو ہم بتا چکے۔ اب بہت سی چھوٹی چھوٹی فروعی تدبیریں ہیں جن کے اختیار کرنے سے بھی اصلاح میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے

اضلاع کی کانگریس کمیٹیوں پر بار ڈالنا

(۱) ہماری رائے میں اتحاد قائم رکھنے کی تدبیروں کا کام ہندوستان کے ہر ضلع کی تحصیل کانگریس کی کمیٹی کے سپرد کیا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے کہ اغراض اتحاد کے لئے وہ حسب ضرورت مقامی غیر مقامی اشخاص کو اپنی کمیٹی کا ممبر بنائیں اتحاد کی عملی تدابیر کرنا تحصیل کانگریس کا دیا ہی

اہم فرض و پروپیگنڈا ہونا چاہیئے جیسا کہ دوسرے سیاسی معاملات کے دستورالعمل پر کاربند ہونا بغیر اتحاد کے سوا راج کا حاصل کرنا محال ہے اور اگر وہ ملا بھی تو بیکار ہوگا۔ ہر ضلع کی یہ کانگریس کمیٹی اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اتحاد بڑھانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔ اگر ممکن ہو تو مقامی عہدہ داروں کو شر و فساد رفع کرنے میں بھی مدد دیگی۔

اتحادی لٹریچر کی بھرمار نقطۂ نظر کا بدلنا

(۲) افسوس ہے ابھی تک نیشنل کانگریس کا کوئی خاص اخبار نہیں ہے ورنہ اُس کا ایک کالم اس کے لئے وقف کیا جاتا تاہم ملک میں اور بہت سے اردو انگریزی اخبار ہیں ان اخبارات اور رسالہ جات کے اڈیٹر ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے بارہ میں ہماری اس رائے سے اگر متفق ہوں جس کا اظہار اس باب کے حصۂ اول دوم میں کیا گیا ہے تو وہ اسی عنوان پر مسلسل مضامین اسوقت تک شائع فرماتے رہیں جب تک کہ لوگوں کا نقطۂ نظر نہ بدل جائے اور اہل ملک کے خیالات میں تبدیلی نہ پیدا ہو۔ محض اتحاد اتحاد پکارنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ مقصد اسوقت حاصل ہوگا جب ملک میں اس قسم کے مضامین کی بھرمار کر دیجائے۔

دہلی کی اتحادی کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنا

(۳) ۱۹۲۴ء کی دہلی کی اتحادی کانفرنس نے بہت کچھ کام کیا ہے۔ جو عام اصول اس کانفرنس نے قایم کیے ہیں ہم ان سے بالکل متفق ہیں کیسی کی مذہبی آزادی میں ذرا سا فرق نہ آنا چاہیئے

ہر شخص کو اختیار ہے کہ خدا کی پرستش کے جذبات وہ جن حرکات جسمانی سے ظاہر کرنا چاہتا ہے کرے۔ خدا اس کا نفرنس کی کوششوں کو کامیاب کرے مگر اسکے بعد کہیں پھر خواب غفلت نہ طاری ہو جائے عملی کام برابر جاری رہے۔

رکنیت کانگریس کی شرط بنانا

(۴) مہاتما گاندھی نے کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط قرار دی تھی کہ ہر ممبر روزانہ تھوڑا سا سوت چرخے میں کاتا کرے۔ مہاتما ممدوح غالباً اس ملک کے پالٹیکس میں روحانیت کے جزو کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس ملک کو ایثار کا سبق سکھا کر تن پوشی کے معاملہ میں دوسرے ممالک کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان خود اپنی سعی و کوشش سے اپنی ضرورتوں کو فراہم کرنے کا عادی ہو۔ اور تن آسانی کی بجائے محنتی بنے لیکن ہندوستان میں اتحاد قائم رکھنے کی اہمیت اگر اس سے کم نہ خیال کیجائے تو ہم اس حد تک بھی کہنے کو تیار ہیں کہ کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط ہونی چاہیے کہ ہر ممبر اتحاد پر ایک مضمون لکھکر کسی اخبار میں شائع کرائے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین اس تحریک کو مذاق سمجھیں یا مخالفین کو تسلیم وجود نفاق کی بحث کا ایک شگوفہ ہاتھ آجائے لیکن مسئلہ کی اہمیت تو اسی کی متقاضی ہے کہ قبل اسکے کہ ایسی کانگریس میں جو انڈین اور نیشنل کہلاتی ہے شرکت کی کوئی شخص

درخواست پیش کریں وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر غور فرما کر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیں اور کم از کم یہ ہو کہ ممبری کے فارم میں اتحاد کی کوشش کرنے کا اُن سے اقرار ہی لے لیا جائے۔

یکجا تعلیم دلانا

(۵) ہم کو ہندو و مسلمانوں کے علیحدہ علیحدہ مدارس کا اصول ہی ناپسند ہے۔ پہلے زمانہ میں دوستی محبت و الفت کی گرہ مکتب ہی میں دی جاتی تھی۔ ہم کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے کہ اپنے ہم مکتب ہندو بچوں سے کٹ کر کے پھر کیسے گھل مل جایا کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح یہ ہمارے بچے پھر ساتھ ساتھ پڑھیں۔ کیونکہ جو تعلقات اور روابط اس عمر میں قائم ہو جاتے ہیں اُن کا توڑنا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے مذہبی تعلقات سے یونیورسٹیاں علیحدہ علیحدہ قائم کر لی ہیں۔ ہم کو تعجب تو یہ تھا کہ مذہب کے نام سے ایسے بڑے بڑے دارالعلوم قائم کرنے کے لئے روپیہ لیا تھا۔ اگر جہاں تک ممکن ہو ہماری پالیسی یہ ہی رہے کہ ہمارے ہندو و مسلمان بچے ایک ساتھ تعلیم پائیں۔ الٰہ آباد کا یہ پاٹ شالہ کالج کا دروازہ مسلمانوں پر بند ہوا اور یہ لکھنؤ کے مسلم ہائی اسکول میں ہندوؤں کا داخلہ ممنوع ہو۔ ہم نہیں بتا سکتے کہ اس وقت کونسا فرق کیا جاتا ہے۔ ہم صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ یہ عام اصول ہمارے ذہن نشین رہیں۔

سوشل تالیف و طرز معاشرت میں یکرنگی کرنا

(۶) ہمارے قدیم تمدن میں جو ملنے جلنے کے مواقع تھے وہ تو اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ محلے محلے میں شام کے وقت

اکھاڑوں کو جاتے ہوئے لڑکوں کے وہ جھرمٹ اب نظر نہیں آتے
ہمارے وہ کم خرچ بالانشین سستے کھیل اور ورزشیں کہیں دکھائی
نہیں دیتیں۔ تبدیلی ترقی کی شرط ہے۔ لیکن اب کلب لائف میں
نئی روح پہونچنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے
ملنے جلنے کے مواقع میں جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ اجنبیت
سے مغائرت بڑھتی جاتی ہے اس کو متواتر ملنے سے محبت میں اضافہ
ہونے کی غرض سے مٹانا چاہئے اگر خورد نوش میں بھی شریک ہو جاتے
تو کیا کھانا تھا۔ خیر وہ وقت جلد آرہا ہے۔

جداگانہ انتخاب

(۷) اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے جداگانہ
انتخاب کے حق میں ہاتھ نہ لگانا چاہئے۔ یہ بھڑوں
کا چھتہ ہے ۱۹۱۶ء کی کانگریس منعقدہ لکھنؤ میں جو قرارداد ہندو اور
مسلمانوں کے درمیان قرار پائی تھی اس سے بہتر ہماری سمجھ میں کوئی
نہیں آئی اس کے طے کرنے میں جو جو دشواریاں محسوس ہوئی تھیں وہ
اس وقت بھی ہمارے دماغ میں تازہ ہیں۔ ہم کو اس سال کانگریس
کی استقبالی کمیٹی کے ایک سکرٹری ہونے کا فخر تھا اور کسی حد تک
اندرونی کارروائیوں سے بھی ہم واقفیت رکھتے ہیں ہم کو پنجاب
و بنگال کے مسلمان بھائیوں سے جنہوں نے اس قرارداد کے خلاف بھی
کہیں آواز بلند کی ہے یہ بات کہنا ہے کہ جو اصول اس وقت طے کئے
گئے تھے وہ تمام ہندوستان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے تھے کوئی

خاص صوبہ ہمارے پیش نظر نہ تھا۔ اس فیصلہ کی عمر (۸) برس کی ہو چکی
اور مرور زمانہ سے اسمیں اور پختگی پیدا ہوتی جائیگی اگر وہ کسی فیصلہ کو
قطعی نہیں سمجھتے اور قدامت کی کوئی وقعت انکی نگاہ میں نہیں ہے تو ہماری
رائے میں ہمارے مسلمان بھائی اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مار رہے ہیں۔
ہر چیز جو آج وہ تیار کرینگے اگر وہ کل پلٹ دی جائیگی۔ تو قدیم روایات کا
قایم رہنا دشوار ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو بعض ہندو برادران وطن سے
بھی جو آجتک مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے اصول کو تسلیم کرنے کیلئے
تیار نہیں ہیں کچھ کہنا ہے۔

اس وقت تمام دنیا کی کامیاب حکومتوں پر نظر ڈالی جائے کہ کیونکر
وہ کامیاب ہیں۔ بطور مثال ہم انگلستان ہی کو لیتے ہیں اگر کوئی ہم سے
پوچھے کہ برٹش پارلیمنٹ کی تعریف کرو تو ہم یہ کہینگے کہ انسانی متضاد
قوتوں اور کششوں کو ایک جگہ جمع کرنے سے جو معتدل و درمیانی
انسانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی برٹش پارلیمنٹ ہے اس کو ہی
حکومت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کچھ لبرل (Liberals)
اور کنزرویٹو (Conservative) اور کچھ لیبر Labour
ممبر ہیں جب لیبر گورنمنٹ ہو جاتی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ
ہر امر کا فیصلہ اپنی اصلی رائے کے مطابق کریگی بلکہ لبرل اور کنزرویٹو
ممبروں کی متضاد کششیں اوس کو درجۂ اعتدال پر قایم رکھتی ہیں ہماری
رائے میں متضاد کششوں کا قایم رہنا برٹش پارلیمنٹ کی روح رواں ہے

اگر ان قوتوں کو نکال ڈالئے تو برٹش پارلیمنٹ کا تصور ہی مفقود ہو جائیگا اور جو کامیابی آج اس انگریزی حکومت کو حاصل ہے وہ ہرگز نہ رہے گی۔ اب انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان پر نظر ڈالئے یہاں بھی متضاد کششیں اور قوتیں موجود ہیں البتہ انکی نوعیت بدلی ہوئی ہے ہماری رائے میں ہندوستان کی حکومت اُس وقت کامیاب ہو گی جب اہل ہند ان متضاد کششوں کے وجود کو تسلیم کرکے اپنا پارلیمنٹ بنائیں گے۔ اگر اس ملک نے اپنی اسمبلی (Assembly) یا پارلیمنٹ کی تنظیم ایسی کردی کہ مسلمانوں کے مخصوص جذبات اُس کو جادۂ اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے کام نہ آسکے تو وہ حکومت ہماری رائے میں نقش بر آب کی مصداق ہوگی۔ یہ تضاد ایسا نہیں ہے کہ اُس سے مجموعی حیثیت سے ملک کا نقصان ہو۔ ہمارے ہندو بھائی یہ کبھی خیال نہ کریں کہ ہندی مسلمان اس ملک کے مفاد کو کسی دوسرے اسلامی ملک کے مفاد کے تابع کردیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا اور یہ محال ہے۔ اس ملک کے مسلمان اپنے اصلی فائدہ کو سمجھتے جارہے ہیں اس مسئلہ پر ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اسی باب کے حصۂ دوم میں ظاہر کرچکے ہیں البتہ ایک ہی ملک میں رہکر ہندی مسلمان اپنی ترقی کے سامان کر رہے ہیں اور دوڑ میں برابر رہنا چاہتے ہیں۔ انکی ترقی ملک کی ترقی ہے۔ اُن کا تنزل ملک کا تنزل ہے۔ ہم تو اگر ہندو

ہوتا تو مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی نسبت یہی رائے دیتا کہ اس معتدل کرنے والی قوت کو قائم رکھیئے۔ ہماری حکومت میں یہ چشم پوشی و گزاشت کے قابل نہیں ہے۔ اتحاد قائم رکھنے کی اور بھی چند دوسری تدابیر ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں آئی ہیں۔

ہندو مسلمانوں میں سیاسی اتحاد ہوکر رہیگا

ہماری رائے میں ہندو مسلمان بڑے بڑے سیاسی مسائل میں ایک ہی نقطہ کی طرف چلے جارہے ہیں۔ گزشتہ (۳۰) برس سے جو حالات ہم خود دیکھ رہے ہیں اُن سے ہماری یہ رائے قائم ہوئی ہے۔ ہم کو ۱۸۹۹ء کا ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ اُس سال کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں تھا۔ ہم کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لکھنؤ جیسے شہر میں ہماری شرکت سے مسلمانوں کو بڑا استعجاب ہوا۔ اُسی زمانہ میں ایک روز جب ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو چند بڑے معزز مسلمان احباب نے ہم کو دیکھکر ہماری شرکت پر مذاق اڑانا شروع کیا اور ہم سے طنزاً اس طرح مخاطب ہوئے۔

"آئیے جناب! ممبر کمیٹی استقبالیہ نیشنل کانگریس"

چندر برس کے بعد ہم نے دیکھا کہ انہی میں سے ایک حضرت کا شمار کانگریس کے بہت بڑے حامیوں اور لیڈروں میں ہوگیا اور اب یہ ایک عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ ایک زمانہ سرسید احمد خاں مرحوم کا تھا جب کہ نہ صرف کانگریس بلکہ تمام سیاسی مجالس میں مسلمانوں کی شرکت

کفر سمجھی جاتی تھی ۔ اُس کے بعد نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر مرحوم کی کوشش سے "مسلم لیگ" قائم ہوئی جسکی بابتہ لوگوں کو ابتدا میں یہ بدگمانی ہوئی کہ وہ کانگریس کی مخالف ہوگی لیکن رفتہ رفتہ وہ ان تحریکات کی آواز بازگشت کا کام کرنے لگی جو کانگریس کے پلیٹ فارم سے منظور ہوتی تھیں ۔ آج وہ زمانہ ہے کہ مسلمان کانگریس میں ضم ہو رہے ہیں ۔ اسکی وجہ کیا ہے ؟ ہماری رائے میں وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت انگریزی کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض مشترک ہیں ۔ ہندوستان کو جس قدر حقوق عطا ہونگے اُن سے بالآخر سب ہندوستانیوں کا فائدہ ہوگا علاوہ بریں سچ کی آخری کامیابی قانون قدرت میں داخل ہے اگر یہ بات سچ ہے کہ بغیر سیاسی اتحاد کے ہندوستانیوں کو سوراج نہیں مل سکتا اور بغیر سوراج یا ہندوستانی حکومت کے اس ملک کے تمدن میں اصلی ترقی نہ ہوگی اور کوئی ہندی بحیثیت ہندوستانی کے بیرون ہندوستان کوئی وقعت نہیں رکھے گا ۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر دکھلایا جا چکا ہے تو یہ سچ بات کسی نہ کسی روز ضرور سمجھ میں آئیگی ۔ اگر انسان سچ بات کو خود نہیں سمجھتا تو دنیا کی مصیبتیں اسکو سکھا دیتی ہیں ۔ دنیا کے تلخ تجربے سچائی کا سبق شدیدتے ہیں ایک نہ ایک دن سچ ضرور غالب ہوتا ہے ۔ یہ قانون قدرت ہے اور یہی وجہ ہمارے اس اعتقاد کی ہے کہ ہندو مسلمانوں کا

سیاسی اتحاد ہو کر رہے گا مسلم لیگ بھی رہے گی - کانگریس بھی رہیگی مگر ان دونوں جماعتوں کا سیاسی مرکز ایک ہی ہو جائیگا - اور جن باتوں میں فرق رہیگا ان کا تعلق صرف اندرونی باہمی معاملات سے ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان کی اب کیا حیثیت ہونی چاہیے

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ مستقل اتحاد قایم کرنے کے لئے مدارس کے ابتدائی درجوں میں عہد ہنود و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جو ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو لڑکوں کو پڑھانی چاہیے لیکن کوئی تاریخ ہند اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک گزشتہ دو سو برس کا حال بھی اسمیں نہ ہو یعنے جب سے عہد مغلیہ کا دور ختم ہوا اور دور جدید کی بنیاد پڑی ہم نے بہت کچھ اپنے قدیم تمدن کی ثناء خوانی کی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی چال بازیوں کو دکھایا ہے اور پچھلے ابواب میں ان اثرات اور قوتوں پر اظہار رنج و افسوس کیا ہے جو ہماری صنعت ۔ حرفت ۔ دولت ۔ تجارت ثروت ۔ فارغ البالی ۔ آزادی ۔ خودداری کو اڑا لے گئیں ۔ اور اس غرض سے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم رہے یہ بھی بتایا ہے کہ عہد مغلیہ کی نسبت اہل ہنود کا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہیے اور مسلمان کس نظر سے اہل ہنود کو دیکھیں لیکن قبل قلم

اُٹھانے کے ملک ہندوستان کے مورخ کو اس کا تصفیہ بھی کرنا ہوگا کہ کہ اسکو موجودہ حکمرانوں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے صحیح واقعات کا لکھدینا ایک اور بات ہے اور اُن واقعات کو ناظرین کے روبرو پیش کرنے کا طریقہ امر دیگر ہے۔ کسی واقعہ کے پیش کرنے کا طریقہ ہی وہ شئے ہے جسمیں مؤرخ کے جذبات ناظرین کے دلوں پر اپنے گل کھلایا کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ لکھتے وقت اس بات کا خوف ضرور ہے کہ ہماری قومی آزادی و خودداری کے چھن جانے سے اور صنعت و حرفت کے مٹنے سے جو جذبات و جوش پیدا ہوں وہ کہیں صداقت کا خون نہ کردیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ صداقت ہر چیز کی مضبوط بنیاد ہے۔ جو عمارت صداقت پر مبنی ہے وہ کبھی منہدم نہ ہوگی یوں تو جوش اور جذبات کی لہریں سنگ صداقت سے بہت کچھ ٹکرائیں گی مگر یہ پتھر ایسا گراں وزن ہوگا کہ اسکو بڑے سے بڑا طوفان بھی جنبش نہ دے سکے گا۔ یہ بڑا اخلاقی جرم ہوگا کہ ہم ان نقصانات کا تو ذکر کریں جو موجودہ حکومت سے ہم کو پہنچے ہیں اور اُن فواید کا اعتراف نہ کریں جس سے ہم مستفید ہو رہے ہیں اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم بھی اس جرم کے مرتکب ہونگے جسکی فرد قرارداد جرم ہم اُن مورخین پر لگا رہے ہیں جو عہد مغلیہ کے صحیح صحیح واقعات درج نہیں کرتے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس کا پیش نظر رکھنا ہندوستان کے مورخ کا فرض ہوگا۔

یوں تو ہر مورخ کے خیالات علیحدہ علیحدہ ہونگے لیکن موجودہ انگریزی حکومت کی نسبت ہمارے جو خیالات ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں ہم اپنے خیال کو اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر جسٹس رینڈے کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور اب پھر مختصر الفاظ میں اُس کے اعادہ کی معافی چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان ایک منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے بہت سے درمیانی منازل ہیں جس طرح عہد ہنود کے بعد عہد مغلیہ اُس کی ایک ضروری طے شدنی منزل تھی اسی طرح موجودہ انگریزی حکومت کی منزل کا طے کرنا بھی قادر مطلق نے ضروری کیا تھا۔

ہم موجودہ حکومت کو اصلی ڈرامے کا ایک سین یا منظر سمجھتے ہیں عہد مغلیہ کے بادشاہ کی ذات و مذہب کا جو جذب مقناطیسی ہمارے دل پر ہو تھوڑی دیر کے لئے اُس سے قطع نظر کرکے ہم دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں انسانوں کے باہمی تعلقات میں کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں چھوت چھات مٹتی جاتی ہے انسان کا پایہ کیسا بلند ہوتا جارہا ہے۔ جو شخص دوسرے کو چھو نہیں سکتا تھا آج وہ دوسروں کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے رہا ہے۔ ہر حکومت میں اب جو انتظامی شاخیں قائم ہوگئیں یا قائم ہوتی جارہی ہیں اُن کے ایک شعبہ کی نگرانی بھی ایک دماغ قابل اطمینان طریقے سے نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کل حکومت کا انتظام پھر نقل و حمل کے ذرائع میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اُس سے اس دنیا کی

تمام حکومتوں میں جو باہمی تعلقات منسلک ہوتے جا رہے ہیں وہ ایک مہین باریک جال کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ہر تار پر نگاہ رکھنا ایک دماغ سے ممکن نہیں۔ ان واقعات کا جو اثر ہر ملک کی طرز حکومت پر پڑا ہے وہ ظاہر ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں حکومت کی قوت انسانوں میں اس طرح تقسیم ہو گئی کہ باید و شاید۔ کیا ایشیاء اس سے بچ سکتا تھا؟ ہر گز نہیں۔ پھر اسمیں یہ تبدیلی کیونکر نہ ہوتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کو پیدا کرنے کے لئے قادر مطلق نے ہر ملک کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ ذرا امریکہ فرانس۔ روس۔ جرمنی۔ یونان۔ چین۔ ٹرکی۔ اور ایران کے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے حالات پر نظر ڈالئے۔ کہیں کشت و خون کی مدد سے کہیں اخلاقی قوتوں کے زور سے کہیں حکمت عملی سے حکومتوں کے تغیرات کا ایک ہی سین و منظر اس دنیا کے تھیٹر میں ہم کو دکھایا جا رہا ہے۔ ہم اسوقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک سچے مورخ کو ہندوستان میں انگلستان کی حکومت کس نقطۂ نظر سے دیکھنی چاہیئے۔ اور اسی وجہ سے یہ واقعات لکھے جا رہے ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ جذبات سے قطع نظر کر کے بلند پروازی کرے اور پھر قدرت کا سماں دیکھے۔

خدا کی زبان اس عالم کے واقعات ہیں اور ان واقعات میں کچھ ایسا تسلسل ہے کہ ہر منزل پر پہنچنے کے بعد جب ہم پیچھے مڑ کر

دیکھتے ہیں تو نتائج کا ایک نیا سماں نظر آتا ہے ۱۸۰۰ء تک جو واقعات گزرے اُن سے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ ظالم ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں کیونکر آ دی ایک صدی کے بعد ۱۹۰۰ء میں عالم اسباب کے عجیب و غریب ڈرامہ کا سلسلہ کچھ سمجھ میں آنے لگا اب گزشتہ چوبیس برس میں جو تغیرات دیکھتے دیکھتے ہمارے سامنے دنیا میں ہو گئے ان پر ہم غور کرتے ہیں - زار (Czar) روس کی نسل کا نام و نشان نہ رہا - قیصر جرمنی لکڑی کی تجارت کر رہا ہے سلطان ٹرکی اپنی بسر اوقات میں دوسروں کا دست نگر ہے - شاہ ایران پیرس میں کھیل تماشے میں مصروف ہے - یونان کا فرمان روا جلا وطن کیا گیا - چین کا بادشاہ تاش کے بادشاہ سے زیادہ عزت نہیں رکھتا یہ وہ عبرتناک واقعات ہیں جو چوبیس برس قبل ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے تھے اب ان چوبیس برس کے واقعات کو اُس کے قبل کے ڈیڑھ سو برس کے واقعات کیساتھ ملا کر دیکھئے - بالخصوص امریکہ و فرانس کے واقعات مورخ کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے مسلسل گذشتہ واقعات سے نتیجے اخذ کرے - قوموں کی حیات و ممات کے متعلق صحیح نتائج وہی ہونگے جن کی تطبیق ان واقعات عالم سے ہو جو قدرت خدا سے دراصل ظہور پذیر ہوئے - خدا اپنا ارادہ اسی عالم اسباب اور انہیں واقعات عالم کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے - جب ہم نتیجہ نکالنے اور اپنی رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

نہ صرف بلکہ تمام دنیا میں طریقۂ حکومت کا بدلنا قادر مطلق کی اسکیم اور پروگرام میں داخل تھا۔ پھر بھلا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ اس سے کسطرح مستثنیٰ کیجا سکتی تھی۔ ہماری رائے میں ہندوستان میں طریقۂ حکومت بدلنے کا مقصد حاصل کرنے کے لئے قادر مطلق نے انگلستان کو یہاں مسلط فرمایا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو ہندوستان نے اس دور حکومت میں سیکھی وہ یہ ہے کہ حکومت کی قوت مختلف افراد میں تقسیم کرکے وہ حکومت زیادہ مستحکم کیونکر بنائی جا سکتی ہے انفرادی واجتماعی حیثیت سے کام کرنے کے اصول بھی اس حکومت نے ہم کو سکھائے یورپ وامریکہ نے جسقدر سوسائیٹیاں اور جماعتیں معاملات دنیوی کو زیادہ مکمل طور سے انجام دینے کے لئے قائم کر رکھی ہیں انکی مثال دنیا کے قدیم تمدن میں نہیں ملتی۔ ہم یہ طریقے بھی انگلستان کے ذریعہ سے سیکھ رہے ہیں۔ اس سے بھی ہمارے اُس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انگلستان دراصل اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہم پر مسلط کیا گیا ہے ابتدا میں کچھ ہی حالت رہی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اب تاریخ ہند میں انگلستان کی پوزیشن (Position) اور حیثیت ایک امین یا معلم کی سی ہو گئی ہے۔

ہندوستان میں انگلستان کے کارنامے و اصلیات

ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین ہمارے اصلی پوائنٹ (Point) اور مقصد کو پیش نظر رکھیں اس وقت ہم کو نہ مہاتما گاندھی کے نان کواپریشن Non cooperation

یعنے ترک موالات سے تعلق ہے اور نہ پنڈت سرینواس شاستری کے کواپریشن (Cooperation) یعنے موالات سے بحث ہے۔ اس حصے میں شروع سے ہم اپنا یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم کرنے کے لئے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ ہندو زمانہ و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جس میں کچھہ چھپایا نہ گیا ہو لڑکوں کو پڑھانی چاہئیے جسکی مفصل کیفیت بیان ہو چکی اسی کے سلسلہ میں ہم اپنا خیال اس امر کے متعلق بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دور موجودہ یعنے انگلستان کے کارنامے بھی ہمارے بچوں کے سامنے کیونکر پیش کئے جائیں ہم یہاں بھی بحیثیت مورخ منافقت سے متنفر ہیں۔ ہم صرف اصولی طور سے یہ بیان کر سکتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں پہلے سے کوئی زہر ڈالنا اور اس سے ان کو متاثر کرنا مناسب نہیں۔ مورخ کے فرائض بہت مقدس ہیں اسکی ذمہ داریاں اہم ہیں۔ اسکو صرف صداقت کے راستے پر چلنا چاہئیے اس راستے میں کہیں کہیں دشواری ضرور پیش آئیگی لیکن وہ ناگزیر ہے۔ مثلاً یہ سچ ہے کہ انگلستان ہم کو نیا طرز حکومت سکہا رہا ہے۔ ہندوستان کے نقل و حمل کے ذرائع و تجارت میں روزافزوں ترقی ہے۔ بڑے بڑے جہاز ساحل ہندوستان پر مال و اسباب سے لدے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔ ریلیں اور موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز اڑتے نظر آرہے ہیں ہندوستان ہزاروں میل کے فاصلہ سے تار اور بے تار دونوں کے ذریعے سے اپنے معاملات دیگر ممالک سے چند منٹ کی گفت و شنید میں طے

کر رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ اس موجودہ دور کے قبل ہم اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور اپنے ہی پاؤں سے چلتے پھرتے تھے۔ اب نئی رفتار و طرز حکومت کے سکھائے جانے کے پیرا میں ہم ابھی تک انگلی پکڑا کر چلائے جا رہے ہیں۔ جہازوں میں مال تو ہے مگر جب مال کا بنڈل اور صندوق کھول کر دیکھتے ہیں تو اُس میں ہماری دولت و صنعت و حرفت مقابلۃً بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ مال کسی اور کا ہے۔ ریلیں اور موٹریں تو ہیں مگر ہم اُنکے انجنیر نہیں ہیں بلکہ ابھی شوفر کا کام انجام دے رہے ہیں اور ہوائی جہازوں کا انجنیر ہونا تو درکنار اسکے شوفر بھی ہم نہیں ہیں۔ صرف دور سے تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ تار اور بے تار کی خبروں کے معاملہ میں ہم ہمہ تن متحیر کھڑے ہیں۔ بنانا تو درکنار ابھی سمجھنے کی بھی قابلیت ہم کو نہیں۔ ان سچی باتوں کے نہ ظاہر کرنے میں اُسی قسم کی افراط و تفریط ہوگی جو بعض عہد مغلیہ کے مورخ اُس کے عیوب دکھا کر اسکی خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مورخ جادۂ اعتدال و صداقت پر رہیں اور ہم ابھی انگلستان سے ناامید بھی نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب ابھی مشرق کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔ بعض اوقات دیکھا ہے کہ جن قومی اوصاف کو ہم اپنی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں اُن پر مغرب انگشت نمائی کرتا ہے اور جن باتوں کو ہم عیوب میں داخل کرتے ہیں اُن کو اہل مغرب فیشن

تہذیب کی علامات سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے موجودہ حکمرانوں پر ابھی ضرب المثل صادق آ رہی ہے کہ "آدمی و کے پیر شدی"۔ قوموں کی تاریخ اور زندگی میں سو ڈیڑھ سو برس ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جیسے افراد کی زندگی میں ایک دو سال۔ انگلستان نے ہندوستان سے ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر ایک ملکہ معظمہ کی زبان کے ذریعہ سے کچھ وعدہ کیا تھا اور پھر ۱۹۱۷ء میں جنگ عظیم کی مصیبت کے وقت اس وعدہ کی توثیق ایک دوسرے جلیل القدر شہنشاہ کی زبان سے کرائی اس دور کے یہ سب سے بڑے کارنامے ہیں اگر انگلستان نے یہ وعدے خود پورے کئے تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے بچے اور ہماری نسلیں احسان و شکر گزاری کے بار گراں سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکینگے دنیا کی تاریخ میں اسکی مثال ملنا دشوار ہوگی۔ ہماری دولت صنعت۔ حرفت۔ خودداری وقعت اور کیرکٹر میں حالت محکومی سے جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی و خانہ پری ایفاء وعدہ سے جلد ہو جائیں گی لیکن اگر بالآخر واقعات و حادثات عالم کے زور نے وعدہ پورا کرایا تو اس میں شک نہیں کہ تاریخ کا آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ انگلستان پر خودغرضی کی انسانی کمزوریاں غالب آگئی تھیں وہ اپنے بار امانت کو برداشت نہ کر سکا۔ یوں تو اس دنیا کی قدرتی قوتیں عمل کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے تینتیس کروڑ بنی نوع انسان بھی ایک نہ ایک دن ضرور ٹھکانے لگیں گے۔ ہماری تاریخ میں موجودہ دور اس طرح گزر جائیگا جیسے کسی لذیذ پلاؤ کے تیار کرنے میں بیچ کا اُبال ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے مقابلہ میں

انگلستان کی اہلیت و قابلیت کا آخری فیصلہ تاریخ اسی بنا دپر کرے گی کہ اُس نے اپنے دور میں ہمارا پایہ بحیثیت انسان بلند کیا یا پست حق ہماری جانب ہے اور ہم کو امید ہے کہ انگلستان کا کیرکٹر بالآخر حق کا ساتھ دیگا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہم اپنے طالب علموں کے سامنے انگلستان کے کارناموں کا کھاتہ بند کرنا نہیں چاہتے۔ دورِ مغلیہ کا کھاتہ تو بند ہو چکا ہے لیکن موجودہ دور کا کھاتہ رواں ہے۔ ہماری رائے میں ابھی ہندوستان کے مورخ کو آخری فیصلہ ابھی نہ نکالنی چاہیئے۔ موجودہ دور کو ہم نہ شب تار سمجھتے ہیں اور نہ روزِ روشن۔ ہماری امیدیں ابھی انگلستان سے وابستہ ہیں۔ ہماری رائے میں ہندوستان کے مورخ کے لئے یہی سچا اور صحیح راستہ ہوگا۔

خاتمہ

ممکن ہے کہ اس کتاب میں کوئی عبارت ایسی ہو جو ناظرین میں سے کسی کے خلاف مزاج ہو اگر ایسا ہو تو اُس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری غرض اس کتاب سے اتحاد پیدا کرنا ہے نہ کہ نفاق۔

گو اب ۱۹۱۸ع سے میں رعایا حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی خدمت کرنے میں مصروف ہوں لیکن اسکے قبل کچھ عرصہ تک ہندوستان کے پالیٹکس (Politics) کے میدان میں کچھ بادیہ پیمائی اور خاک بیزی کر چکا ہوں۔ میں اس کو بخوبی محسوس کر رہا ہوں کہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی کا سیاسی اثر ہم پر کیا ہوگا۔ یہی اندیشہ

اس کتاب کے لکھنے کا محرک ہوا ہے - اگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں عشر عشیر بھی کامیابی ہوئی تو میں یہ خیال کروں گا کہ میری کل محنت وصول ہو گئی - بالآخر ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم انسان تیرے بندے کمزور ہیں - بغیر تیری مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا - اے خدا مدد کر - اور اس ملک کے تمام باشندوں میں اتفاق پیدا کر تاکہ اسکی رو سے ہم منزل مقصود تک پہنچ سکیں فقط

سیف اللہ بیگ

۳ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ ۵ دسمبر ۱۹۲۴ء

ختم شد

قطعہ تاریخ طبع کتاب ہذا

از مولوی امداد اللہ حسینی صاحب اسد صنعہ ارکان مجلس عالیہ عدالت سرکار عالی

مندر میں ہندو مطمئن - مسجد میں مسلم مطمئن
تھے بے الم ہندو مسلماں عہد عالمگیر میں

۱۳ ق ۲۴

تاریخ لکھتے ہیں اسد نواب زریار جنگ
ہندو مسلماں ایک تھے یاں عہد عالمگیر میں

۱۳ھ ۴۳ھ

